قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1981

اس پرچہ میں :-

ثواب کسے کہتے ہیں؟

اگلے پرچہ میں :-

قرآنی آئین کے بنیادی خط و خال

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵- بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلی فون نمبر
۸۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان -/۳۶ روپے
غیر ممالک -/۸۶ روپے

قیمت فی پرچہ
۳
تین روپے

جلد ۳۴ | ستمبر ۱۹۸۱ء گلبرگ ۲ لاہور | شمارہ ۹

فہرست

۱۔ لمعات ——— (نذرِ اقبالؒ) ---------- ۲
۲۔ احباب، کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی لمیٹڈ ---------- ۹
۳۔ انا نم آرزوست! ---------- (محترم پرویز صاحب) ---------- ۱۰
۴۔ قرآنی درس کے اعلانات ---------- ۳۲
۵۔ وضعِ حدیث ---------- (علامہ اسلم جیراجپوریؒ) ---------- ۳۳
۶۔ ثواب ہوتا کیا ہے؟ ---------- (محترم پرویز صاحب) ---------- ۴۵
۷۔ باب المراسلات ——— (۱) سورۃ القریش کی اہمیت۔ قیامِ نظامِ اسلامی کی بنیادی شرائط ---------- ۵۷
(۲) حفظِ قرآن یا ناظرہ قرآن ——— (۳) اُمّت میں اتحاد ———
(۴) کتاب و سنّت اور مختلف فرقے ——— (۵) پنجۂ ہنود ———
(۶) صدرِ مملکت نے فرمایا ———
(۷) تاریخ اس طرح بنتی ہے! ———

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۷۔ ایبک روڈ۔ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

(نذرِ اقبالؒ)

پاکستان کا مطلب کیا؟

یومِ آزادی کی تقریب کے سلسلہ میں ہم اپنے خیالات و جذبات کا اظہار طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۸۱ء کے لمعات میں کر چکے ہیں۔ وہ سطور ماہ جولائی میں رقمزد ہوئی تھیں، لیکن جب ۱۴ اگست کی صبح نمودار ہوئی تو ہماری کیفیت یہ تھی کہ ؎

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ — آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

لیکن ہم نے ان طوفانوں کو پھر قطرات میں منتقل کر دیا کہ ضبطِ عشق کا یہی تقاضا تھا۔

اُبھرنے کو تو تحریکِ پاکستان کی بہت سی یادیں اُفقِ سینہ سے اُبھریں لیکن ان میں سرِ فہرست وہ چند الفاظ تھے جن میں پاکستان کا مفہوم، مطلوب و مقصود اس جامعیت سے سمو دیا گیا تھا، جس کی مثال کم ملے گی۔ نہ معلوم یہ الفاظ کس نے کہے تھے لیکن تھے ایسے مقبول کہ پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں میں سے ہر ایک کی زبان پر تھے۔ وہ الفاظ تھے:-

پاکستان کا مطلب کیا؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

تحریکِ پاکستان کے دوران تو پاکستان مطلب — لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ — کہہ کر سمجھا دیا گیا لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد کسی نے یہ نہ سمجھایا کہ خود لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب کیا ہے؟ تحریکِ پاکستان کے دوران، داعیانِ پاکستان اور اس کے مخالف علماء (مذہبی پیشواؤں) کے درمیان مابہ النزاع مسئلہ ہی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب اور مفہوم تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی پرستش جائز نہیں۔ اور داعیانِ پاکستان کہتے تھے کہ اس کا مطلب ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰)

ط:- یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ ۱۲ اگست ۱۹۸۱ء کی شب کو لاہور ٹیلیویژن سے نشر ہونے والے ایک انٹرویو میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس ترانہ کے خالق پروفیسر اصغر سودائی ہیں جنہوں نے اسے ۱۹۴۴ء میں لکھا تھا۔ ہم سودائی صاحب کی خدمت میں، ان کی اس زندہ جاوید تخلیق پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے آرزومند ہیں کہ خدا اس قوم کو، اس "سودائی" کی کہی ہوئی بات سمجھنے کا شعور عطا فرمائے۔

یعنی خدا کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو "خدا کی پرستش" کی آزادی حاصل ہوگی۔ ان کے معتقدات میں کوئی دخل نہیں دے گا۔ وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ شعائر و ارکانِ اسلام کی ادائیگی پوری آزادی سے کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات ان کے فقہی قوانین کی رُو سے طے پائیں گے۔ وہ کہتے تھے کہ اسی کا نام اسلام ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا یہی مطلب ہے۔ اور اس کے لئے مسلمانوں کو الگ مملکت کی ضرورت نہیں۔

ہم ان سے کہتے تھے کہ اِلٰہ کے معنی پرستیدہ (جس کی پرستش کی جائے) اور عبادت کے معنی پرستش نہیں۔ اِلٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار یا حکمران کے ہیں، اور عبادت کا مفہوم ہے محکومیت۔ اس اعتبار سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ اور عبادت سے مراد ہے خدا کی محکومیت اختیار کرنا۔ خدا کی حکمرانی کا عملی ذریعہ اُس کی کتاب (قرآنِ مجید) کی حکومت ہے اور اسلام سے مراد ہے قرآنِ مجید کی حکمرانی۔ اس اسلام کی اجازت کوئی مملکت بھی نہیں دے سکتی۔ نہ ہی کسی غیر مسلم مملکت میں اس کا امکان ہے۔ کتاب اللہ کی رُو سے، کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ انسانوں کی حکومت کی کوئی شکل ہو، قرآن کی رُو سے اُس کی اطاعت، غیر اللہ کی اطاعت، فلہٰذا کفر اور شرک ہے۔ "انسانوں کی حکومت" میں، عہدِ پارینہ کی ملوکیت سے لے کر عصرِ حاضر کی جمہوریت تک، سب شامل ہیں حتیٰ کہ فقہی قوانین کی اطاعت بھی انسانوں کی اطاعت ہے کیونکہ وہ قوانین بھی اُن ماہرینِ قوانین کے وضع کردہ ہیں جو انسان ہی تھے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا صحیح مطلب، قرآنی حکومت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اور اس قسم کی حکومت اپنی آزاد مملکت ہی میں قائم ہو سکتی ہے۔ اسلام کا یہی تقاضا نفاذ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ تھا۔

تحریکِ پاکستان کے دوران حقیقی نزاع، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے مطلب کا یہی اختلاف تھا۔ یہ جنگ اوّل تو انگریز یا ہندو کے خلاف تھی ہی نہیں کیونکہ وہ مذہبی سطح پر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اور اگر تھی بھی تو اس کی حیثیت ثانوی تھی، بنیادی جنگ، داعیانِ پاکستان اور مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کے مابین تھی۔ ہندو اگر اس مطالبہ کے خلاف کبھی مذہبی دلیل پیش کرتا تھا تو اس لئے کہ اُس کے مذہب کی رُو سے، مذہب کو سیاست سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اور یا اس لئے کہ خود مسلمانوں کے علماء یہی دلیل پیش کرتے تھے۔ (مثلاً) مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے نزدیک اسلام کا ماحصل "خدا پرستی اور نیک عمل کی زندگی" تھا۔ (یعنی وہی "پرستش" کا تصور)۔ ان کے پیش کردہ اس تصور کو ہندوؤں نے اپنے اہتمام سے سارے ملک میں عام کیا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے جب ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر مسلمانوں کی جُدا مملکت کا تصور پیش کیا تھا، تو ایسا اچانک یا کسی ہنگامی جذبہ کے تحت نہیں کیا تھا۔ اُن کی ساری عمر "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا مطلب سمجھانے میں گذر گئی تھی۔ انہوں نے (مثنوی رموزِ بے خودی) میں پہلے یہ بتایا کہ نزولِ قرآن سے پہلے انسانوں کی حالت یہ تھی کہ ؎

بُود انسان در جہاں انساں پرست　　ناکس و نابود مند و زیر دست

اس میں "انسان پرست" کا ٹکڑا غور طلب ہے۔ اس میں ہر قسم کی انسانی حکومت آجاتی ہے، یعنی ؎

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش　　بندہا در دست و پا و گردنش

یہ ملوکیت کی "انسان پرستی" (غلامی اور محکومی) تھی۔ اس کے ساتھ ؎

کاہن و پاپا و سلطان و امیر — بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر

یہ تھیاکریسی (یعنی مذہبی پیشواؤں کے فقہی قوانین) کی محکومی تھی۔ ملوکیت اور تھیاکریسی کے گٹھ جوڑ سے حالت یہ ہو چکی تھی کہ ؎

صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت — باج بر کشتِ خرابِ او نوشت
در کلیسا اُسقفِ رضواں فروش — بہرِ ایں صیدِ زبوں دامے بدوش

(رموزِ بے خودی۔ صفحہ ۱۱۹)

غریب و مفلس۔ محنت کش و مزدور۔ مزارع و کاشتکار بیچارے، دونوں ہاتھوں سے لٹتے تھے۔ ایک طرف حکومت اپنے ٹیکس وصول کرتی تھی۔ دوسری طرف مذہب کے نام پر ان کا خون نچوڑا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ؎

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ — نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ (ایضاً)

نزولِ قرآن کے وقت . . . انسان کی یہی حالت تھی۔ وہ ایک طرف مستبد حکمرانوں کی ذلت آمیز اور اذیت ناک زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے غضبناک اور قہر آلود بندھنوں میں بندھا ہوا، کہ انقلابِ محمدیہ نے (وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)) فرعونوں کی ان زنجیروں کو توڑ دیا اور ہامانوں کی ان بندشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اس طرح انسانوں کو انسانوں کی محکومیت سے آزاد کرا دیا۔

تا امینِ حق بحق داراں سپرد — بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
شعلہ ہا از مردہ خاکستر گشاد — کوہکن را پایۂ پرویز داد
قوتِ او ہر کہن پیکر شکست — نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید — بندہ را باز از خداونداں خرید

(رموزِ بے خودی۔ صفحہ ۱۱۹-۱۲۰)

حضرتِ علامہ نے اس آخری مصرعہ میں قرآن کے انقلابِ عظیم کا ماحصل چار لفظوں میں سمو کر رکھ دیا ہے، جب کہا ہے کہ "بندہ را باز از خداونداں خرید"۔ یعنی انسانوں کو انسانوں کی محکومیت سے آزاد کرا دیا ــــــ خواہ وہ انسان قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کے نمائندے تھے اور خواہ مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ خداوند!

سوال یہ ہے کہ اس انقلابِ عظیم کا نقطۂ ماسکہ یا بنیادی محرک کیا تھا؟ علامہ اقبالؒ نے (قرآنِ کریم کی روشنی اور راہنمائی میں) بتا دیا تھا کہ یہ سب کرشمہ اور اعجاز تھا لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہ کا۔

یہ کلمۂ انقلاب آفریں دو گوشوں پر مشتمل ہے:- "لَا إِلٰہَ + إِلَّا اللّٰہ"

"لَا إِلٰہَ" ہر انسانی حکمرانی سے انکار، بلکہ اس کے خلاف اعلانِ بغاوت۔ اور "إِلَّا اللّٰہ"، کتاب اللہ کی حکومت کا اثبات۔ اقبالؒ کا سارا کلام اسی حقیقت کی تفسیر ہے۔ وہ اپنی دوسری مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں کہتے ہیں۔

درجہاں آغازِ کار از حرفِ لا است — ایں نخستیں منزلِ مردِ خدا است
پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات — تازہ از ہنگامۂ او کائنات
بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟ — تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز
لا مقامِ ضربہائے پے بہ پے — ایں غو رعد است نے آوازِ نے

(پس چہ باید کرد - ص ۱۹)

لا الٰہ کو مسلکِ حیات قرار دینے والے کو قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ اقبالؒ اسے مردِ حُر (یعنی بندۂ آزاد) سے تعبیر کرتا ہے۔ مردِ حُر کے متعلق وہ کہتے ہیں :-

مردِ حُر از لا الٰہ روشن ضمیر — می نہ گردد بندۂ سلطان و میر
ما کلیسا دوست، ما مسجد فروش — او ز دستِ مصطفےٰ پیمانہ نوش
درجہانِ بے ثبات او را ثبات — مرگ او را از مقاماتِ حیات (ایضاً)

جاوید نامہ میں وہ خود غو رعد (بجلی کی کڑک) بن کر یوں غلغلہ انداز ہوتے ہیں :-

لا الٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں — تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں
ایں دو حرفِ لا الٰہ گفتار نیست — لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است — لا الٰہ ضرب است و ضربِ کاری است

(جاوید نامہ - صفحہ ۲۳۴)

آپ نے غور فرمایا کہ مصورِ پاکستان نے لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم کس دلنگاف انداز میں سمجھایا تھا۔ لا الٰہ انسانوں کی ہر حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ تھا، اور وہ اس جنگ کے مضمرات سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی آخری تحریر (ارمغانِ حجاز میں) کہا تھا کہ :-

بنورِ تو برافروزم نگہ را! — کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چو می گویم مسلمانم، بلرزم — کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را! (ایضاً ص ۸)

اس سے آپ نے اندازہ فرما لیا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران جب کہا گیا تھا کہ

پاکستان کا مطلب کیا ــــ لا الٰہ الا اللہ

تو اس میں، لا الٰہ الا اللہ کا مطلب کیا تھا؛ اس کا مطلب تھا ــــ انسانوں کی ہر قسم کی حکومت کو ختم کرکے اس کی جگہ کتاب اللہ کی حکمرانی کا ثبت کرنا۔ اسی کا نام توحید ہے جس کی وضاحت اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی ہے :-

جب توحید ایک عملی نظام کی شکل اختیار کر لے تو اس کا لازمی نتیجہ مساوات، محکمیت اور آزادی ہوگا۔ اسلام نہ کسی انسان کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے نہ مذہبی پیشواؤں کے مبینہ الوہیاتی اقتدار کو۔

(خطباتِ تشکیلِ جدید۔ انگریزی - ص ۱۴۷)

یہی وہ قرآنی مملکت جسے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے انقلاب آفریں ہاتھوں نے قائم

کیا اور ساری دنیا میں اعلان کیا کہ آکر دیکھ لو کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست — عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

یہ نتیجہ تھا اس انسانیت ساز تغیر کا کہ

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۹۰)

قرآن نے ملوکیت کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس قوم (ہم مسلمانوں) نے کیا کیا، اسے بھی اقبالؒ کے الفاظ میں سن لیجئے :-

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست!

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقشِ از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر!

عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۸۹)

یعنی جس قوم نے دنیا سے ملوکیت کا خاتمہ کیا تھا، اس نے پھر نظامِ ملوکیت قائم کر لیا! بظاہر یہ ایک سیاسی انقلاب تھا، لیکن (اقبالؒ کہتا ہے کہ) یہ سیاسی انقلاب نہیں تھا۔ اس نے دین پر ملوکیت کا ٹھپہ لگا کر اسے مذہب میں تبدیل کر دیا، کیونکہ دین ملوکیت کو راس آ ہی نہیں سکتا۔ اور یہ تبدیلی مذہبی پیشوائیت کے تعاون سے (بلکہ اس کے بل بوتے پر) رونما ہوئی۔

اس دن سے لے کر آج تک ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت، باہموں میں باہیں ڈال کر اُمت کو دین سے برگشتہ کئے چلی آ رہی ہے۔ علامہ اقبالؒ اس (مروجہ) اسلام کی جگہ قرآن کا الدین قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس الدین (یعنی قرآنی نظامِ حکومت) کے قیام کا امکان ہندوستان میں تو ایک طرف، خود مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی نہیں، کیونکہ یہ مملکتیں بھی، ملوکیت[1] اور مذہبی پیشوائیت کا ملغوبہ تھیں۔ ہزار سال کی اس دُہری غلامی سے اُن کی یہ حالت ہو چکی تھی کہ

لَا اِلٰہ اندر نمازش بود و نیست — نازہا اندر نیازش بود و نیست

نور در صوم و صلوٰتِ او نماند — جلوۂ در کائناتِ او نماند!

روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام — فرد ناہموار و ملت، بے نظام

سینہ ہا از گرمئی قرآں تہی! — از چنیں مرداں چہ اُمید بہی

ہر کسے بر جادۂ خود تند رو — ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دو (جاوید نامہ صفحہ ۲۳۵)

لیکن اس کے باوجود وہ (اقبالؒ) اس سے مایوس نہیں ہوا ۔۔۔۔ جس کی نگاہیں قرآنی بصیرت سے مستنیر

---

[1] واضح رہے کہ ملوکیت سے مراد صرف بادشاہت نہیں۔ اس سے مراد ہر غیر قرآنی نظام ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو اور وہ کسی کے ہاتھوں متشکل ہو۔ اس وقت (مسلمانوں کی مملکتوں سمیت) ساری دنیا میں ملوکیت مسلط ہے۔

ہوں وہ مایوس ہوا ہی نہیں کرتا۔ وہ نامساعد حالات کی تہ بہ تہ تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھ لیتا ہے۔ انہوں نے اس کا حل یہ سوچا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو، اور اس لوحِ سادہ پر قرآنی اسلام کا نقش ثبت کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس مجوزہ مملکت کا تصور پیش کرتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ اس سے ہم انگریز یا ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کر لیں گے، نہ ہی انہوں نے یہ کہا تھا کہ اس سے ہم پر معیشت کی راہیں کھل جائیں گی۔ یہ تمام مقاصد ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ

> اس سے ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم اسلام پر سے اس نقش کو مٹا سکیں جسے عرب ملوکیت نے اس پر ثبت کر رکھا ہے۔　　　(خطبہ الٰہ آباد)

یہ تھا ہمارے اس حسین و سادہ لیکن عظیم انقلاب آفریں سلوگن کا مقصود کہ

پاکستان کا مطلب کیا؟　　　لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

یعنی　　　اس قرآنی نظام کا قیام جو :

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے　　　نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشین　　　(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ)

لیکن اقبالؒ کے اس خواب کی جو تعبیر ہم نے متشکل کی، اُسے :

کسی بتکدہ میں بیاں کروں، تو کہے صنم بھی "ہری ہری"!

ہم نے اللہ کو تو (معاذ اللہ) ملک بدر کر دیا، اور فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کے آلا تراش کر انہیں اپنا معبود بنا لیا۔ صدرِ اوّل میں تو پھر بھی قرآنی نظام قائم ہو جانے کے بعد، ہمارا تختہ اُلٹا تھا۔ یہاں ہمیں چھڈوٹوں بھی اس کا عکس تک، دیکھنا نصیب، نہ ہوا۔ کاہن دا با کی وہی قوتیں جنہیں شکست فاش ہوئی تھی، یورش کر کے یہاں آگئیں اور اُنہوں نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا وہی مطلب یہاں عملاً ثبت کر دیا جسے وہ متحدہ ہندوستان میں اسلام کہہ کر پیش کرتی تھیں۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ اُس اسلام کے لئے الگ مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہاں ان کے اس اسلام کو دیکھ کر جسے وہ پاکستان میں رائج کر رہے ہیں، ہماری نئی نسل نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ اِس اسلام کے لئے ملک کو تقسیم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

یوں ہم نے اپنی جیتی ہوئی بازی ہار دی ہے، اور قیامت، بالائے قیامت، کہ ملک میں شاید ہی کوئی آنکھ ہو جو اس شکست کے مضمرات کو دیکھ رہی ہو! ایسی حالت اُس وقت ہوتی ہے جب

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اور احساسِ زیاں کے جاتے رہنے سے اہلِ کارواں کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ، رہزن کو یہ کہہ کر دعائیں دیتے ہیں کہ

نہ لٹتے دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتے؟　　　(غالب بہ ادنیٰ تصرف)

قوموں کی تباہی اِس "بے خبر سونے" کا نتیجہ ہوتی ہے۔

شکریہ پرسشِ غم کا!

میرے رفیقِ عزیز، میرے ہم نفس و ہم آہنگ میرے برادرِ بزرگ، شیخ سراج الحق (طاب ثراہ) کے سانحۂ انتقال پر ملک کے اطراف و جوانب سے احباب نے تعزیت کے خطوط کے ذریعے میری غمگساری کی ہے۔ انہوں نے جس خلوص اور محبت سے میرے غم میں شرکت کی ہے، اس سے میرے زخموں کے مندمل ہونے میں بڑی مدد ملی ہے۔ میرے لئے مشکل ہے کہ میں ان احباب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کروں، اس لئے اس اجتماعی اظہارِ تشکر پر اکتفا کرتا ہوا، ان سے معذرت خواہ ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے سحابِ کرم سے نوازے اور مجھے توفیق عطا فرمائے کہ مجھ سے انہوں نے جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، انہیں پورا کر سکوں، اگرچہ سفر کی اس تنہائی میں راستے کی مشکلات فزوں تر ہو گئی ہیں۔

پرویز

——— (۰) ———

اور شکریہ اظہارِ مسرت کا بھی

اس کے ساتھ ہی میں شکر گذار ہوں ان احباب کا بھی جنہوں نے جشنِ نزولِ قرآن (عید الفطر) کی تقریب پر مجھے عید کارڈ بھیجے۔ اگرچہ میں اس رسم کو اسراف سمجھتا ہوں لیکن چونکہ ان کا جذبۂ محرکہ میرے ساتھ ان کے وہ قلبی تعلقات ہیں جو خالصۃً قرآن کی بنیادوں پر استوار ہیں، اس لئے اس کی قدر افزائی لازم ہے۔ یہ شکر گذاری اسی کا اظہار ہے۔

پرویز

——— (۰) ———

معذرت

پرویز صاحب کی بعض تازہ تصانیف (مثلاً "تصوف کی حقیقت") اور ان کی بعض سابقہ تصانیف (جو نایاب ہو رہی ہیں) کے نئے ایڈیشنوں کے شائع ہونے میں جو تاخیر ہو رہی ہے اس کے متعلق ہمیں بکثرت استفسار موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ اس تاخیر کی ایک وجہ طباعت کی موجودہ قانونی پابندیاں ہیں۔ بایں ہمہ ہم اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ یہ کتابیں جتنی جلد ممکن ہو، اشاعت پذیر ہو جائیں۔ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ۔

(ناظم ادارہ)

——— (۰) ———

(کم از کم) ایک نویدِ خوش آہنگ

پرویز صاحب کے تین حالیہ مقالات۔

(۱) حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ۔

(۲) کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟ اور

(۳) دو قومی نظریہ — اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی نظروں میں۔

طلوعِ اسلام میں بھی چھپے، اخبارات میں بھی شائع ہوئے، اور الگ الگ پمفلٹوں میں بھی۔ ان کی افادیت اور مقبولیت کی بنا پر، قارئین کا تقاضا تھا کہ انہیں ایک کتابچہ کی شکل میں (یکجا) شائع کیا جائے، اور نہایت دیدہ زیب شکل میں، تاکہ

انہیں دوستوں کو بطور تحفہ دیا جا سکے۔ ادارہ نے ان کے اس تقاضا کے پیشِ نظر، ان مقالات کو ان کے شایانِ شان، حسین، دلکش اور جاذبِ نگاہ انداز میں کتابچہ کے پیکر میں شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے:۔

حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ

اس کی زیبائی اور رعنائی کے پیشِ نظر، اس کی قیمت فی جلد دس روپے ہے۔ کاپیاں اس کی بہت کم تعداد میں موجود ہیں۔

(ناظم ادارہ)

(٥)

احباب کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی لمیٹڈ

طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۸۱ء میں بتایا گیا تھا کہ احباب کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی اور قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے لئے ملکیتِ اراضی کے سلسلے میں کونسا مرحلہ درپیش ہے۔ یہ مرحلہ محکمۂ مال سے انتقال کی توثیق اور فردات ملکیت کا حصول تھا۔ سال بھر کی تگ و تاز کے بعد انتقالِ اراضی کی توثیق بھی ہو گئی اور ہمیں فردِ اراضی بھی مل گئیں، لیکن ان کی شکل ایسی ہے جس کی رُو سے ہماری سکیم عملی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔ حکومت کی طرف سے ہمیں ایک سو پچاسی کنال پر مشتمل ایک (COMPACT) رقبہ ملا تھا لیکن محکمۂ اشتمالِ اراضی کی طرف سے جس رقبہ کو ہماری ملکیت میں دیا گیا ہے، اس میں متعدد چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دوسرے لوگوں کے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جن کی وجہ سے ہمارا یہ رقبہ (COMPACT) نہیں رہا اور یوں ہماری سکیم بروئے کار نہیں آسکتی۔ محکمۂ اشتمالِ اراضی کا کہنا ہے کہ ایسا سہواً ہو گیا ہے اور وہ اپنی غلطی کی تصحیح کر دیں گے۔ اگر انہوں نے ایسا کر دیا تو ہو المراد۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو اس کے لئے ہمیں کسی بلند سطح پر چارہ جوئی کرنی ہوگی۔ اس کا فیصلہ جنرل کونسل کی میٹنگ میں کرنا ہوگا۔ اگر میٹنگ بلانی پڑی تو اس کے لئے حسبِ معمول اراکین کو نوٹس دیا جائے گا۔

(۲) طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۸۱ء میں احباب کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی اور قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ وضاحت طلب ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے جو انتقالِ اراضی کے سلسلے میں حکومت اور احباب سوسائٹی کے مابین عمل میں آیا ہے، مقصود بالذات قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ہے اور احباب کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے قائم کی گئی ہے۔ اس کے تحت بسائی جانے والی کالونی کا بھی مقصد یہ ہے کہ وہ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کو اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے خود مکتفی بنا سکے۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی اپنے مقاصد، پروگرام اور نظم و نسق میں تا طبقہ آزاد ہے اور اس میں کوئی دخیل نہیں ہو سکتا۔ لیکن احباب کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کا وجود قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر (خدانکردہ) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ناکام رہ جائے یا احباب کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی اپنی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں قاصر رہ جائے جو قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے سلسلے میں، اس پر عائد ہوتی ہیں، تو احباب سوسائٹی کا وجود ہی باقی نہ رہ سکے گا۔ اس اعتبار سے قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کی اہمیت اور احباب کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کی پوزیشن واضح ہے۔ (۲۴ اگست ۱۹۸۱ء)

(چوہدری) محمد حسین
سیکرٹری، احباب کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی لمیٹڈ

(میرزا) محمد خلیل
خازن، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ)

(٥)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانم آرزوست

(انسانوں کی تلاش!)

محترم پرویز صاحب کا پانچ سال پہلے کا خطاب ، آج جس کی اہمیت پہلے سے بھی زیادہ ہے

عزیزانِ من! اس خطاب میں، میرے پیشِ نظر اس تباہی کا دلسوز اور جگر خراش تذکرہ ہے جو نہ کسی خاص خطۂ زمین تک محدود ہے اور نہ کسی خاص قوم یا مملکت سے مخصوص - یہ اس جہنم کا جاں سوز

عالم گیر فساد

تذکرہ ہے جس میں آج پورے کا پورا عالمِ انسانیت جھلس رہا ہے - اور جس سے نکلنے کی کوئی راہ وہ اپنے سامنے نہیں پاتا - قرآنِ کریم نے اپنے زمانہ نزول کی عالم گیر تباہی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (۳۰/۴۱)

کرۂ ارض پر خشکی اور تری میں، ہر جگہ فساد برپا ہے - اور یہ سب، لوگوں کا اپنا کیا کرایا ہے - ان کے ذمہ دار خود ان کے خود ساختہ نظامِ حیات ہیں -

اُس زمانے میں، دنیا میں روم اور ایران کی دو سب سے اہم تہذیبیں تھیں - اور یہ دونوں پستیٔ اخلاق و کردار کے جن عمیق گڑھوں میں گر چکی تھیں، ان پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں - لیکن دنیا کی جو حالت آج ہو چکی ہے، اس میں اِس فساد کی وسعتیں حدود فراموش اور طغیانیاں ساحلِ ناآشنا ہیں - آج، وسائلِ رسل و رسائل کی عمومیت اور ذرائعِ مواصلات و ابلاغ کی عالمگیریت نے، ساری دنیا سمٹ کر، ایک قطعۂ ارض بن گئی ہے - جس میں ان انسانیت سوز خرابیوں کے جراثیم وبائی امراض کی شکل اختیار کر چکے ہیں، جن سے اس کا کوئی کونہ کھدرا تک محفوظ نہیں رہ سکتا - قرآنِ کریم نے ایک آنے

والے دور کے متعلق کہا تھا کہ

كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيْرًا (۷۶/۷)

اس میں شر کی چنگاریاں فضا میں اڑتی پھریں گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس میں، ہمارے ہی دور کی طرف اشارہ ہے جس میں، اقبالؒ کے الفاظ میں کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ ——— شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب ——— مشرق و مغرب سب اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ اس میں حالت یہ ہے کہ ——— عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ ——— اور اس کی وجہ سے، بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ——— نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری ——— بہرحال یہ ہے وہ عالمگیر تباہی کا جہنم جس میں آج ساری دنیا مبتلائے عذاب ہے اور جس سے نکلنے کی کوئی راہ کسی کو نہ دکھائی دیتی ہے نہ سجھائی۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا اس قسم کا منظر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔

اقبالؒ نے آج سے بہت پہلے کہا تھا کہ ؎

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے!

بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

یورپ کا واویلا

یہ آج سے کوئی چالیس بیالیس سال پہلے کی بات ہے۔ لیکن اس کے بعد، یورپ کے جراحت ہائے پنہاں کے درد کی شدت اس قدر بڑھ گئی کہ اس کی چیخ و پکار نے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد رابرٹ بریفو نے لکھا تھا کہ

> یہ جنگ، مع اپنے تمام بہیمانہ مظاہروں کے جن کی وجہ سے آج ہمارا شعور گوناگوں وحشت انگیزیوں کا مسکن بن رہا ہے، کوئی ہنگامی واقعہ یا اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ یہ تمام مجرمانہ حماقتیں، تمام منافقتیں، تہمت تراشیاں اور دروغ بافیاں، یہ تمام سنگدلانہ حرکات، انسانی زندگی اور قوت اور دولت کی یہ تمام بربادی اور دہشت انگیز تباہی۔ غرضیکہ یہ پورے کا پورا پاگل پن اور اس کا ایک ایک عنصر، ہماری قبل از جنگ کی مغربی تہذیب کے اندر موجود تھا۔ جنگ دراصل ان تمام مذموم افعال اور نفرت انگیز اعمال کا مرئی اوتار یا محسوس مظاہرہ تھا جن کی مسموم فضا میں ہم گھرے ہوئے تھے۔ جنگ نے صرف اتنا ہی کیا کہ ان بھیانک چہروں سے نقاب الٹ دیا۔

(THE MAKING OF HUMANITY)

اسی دور کے ایک ماہر تجزیۂ نفس، ڈاکٹر ولیم سٹیکل نے لکھا تھا:۔

> پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جرائم عام ہو چکے ہیں۔ چوری ایک مہذب ہنر بن چکی ہے، صرف اس کا نام بدل دیا گیا ہے۔ اب اسے کاروبار (بزنس) کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ قتل ایک عام بات ہو چکی ہے۔ سرمایہ شہنشاہِ مطلق ہے۔ جنگ سے سہل انگاری

عام ہو چکی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ کسی طرح مفت میں دولت ہاتھ آجائے اور کام نہ کرنا پڑے۔ اخلاق کا معیار بہت پست ہو گیا ہے۔ معاشرہ کی شرم کا اب احساس تک نہیں رہا۔ اب شرم صرف اسے آتی ہے جو دوسروں کا خون چوسنے میں ناکام رہ جاتا ہے۔ جنگ کے بعد قمار بازی کا چسکا عام ہو گیا ہے حتیٰ کہ اب وہ جنون کی کیفیت اختیار کر چکا ہے۔ جوئے کی سینکڑوں مہذب قسمیں ایجاد ہو چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شراب خوری۔ اس سے بوڑھے، بچے سب کی قوتِ عمل تباہ ہو جاتی ہے۔ اور لوٹ مار، اور تباہ کاری کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ (PECULIARITIES OF BEHAVIOUR)

آپ غور کیجئے عزیزانِ من! اگر میں یہ نہ بتاتا کہ اس میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد، اقوامِ مغرب کا نقشہ کھینچا گیا ہے، تو آپ یہی سمجھتے کہ یہ خود ہمارا تذکرہ ہو رہا ہے! بہرحال اس اخلاقی پستی کا آغاز پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے ہوا۔ اور جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا، حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد، یہ خرابیاں انتہائی شدت اختیار کر گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں لارڈ سنیل کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی (THE NEW WORLD) اس میں اس نے لکھا تھا:-

نوعِ انسان کی پوری تاریخ میں اس قسم کا دَور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وقت تہذیب ایک دوراہے پر کھڑی ہے اور یہاں سے اگر ایک قدم بھی غلط سمت کی طرف مڑ گیا تو وہ اسے برباد بلکہ فنا کر دے گا۔ یوں تو انسان کی طول و طویل تاریخ میں بہت سے حوادث آئے ہیں لیکن موجودہ حادثہ نہ صرف ان سے وسعتوں اور پہنائیوں میں بڑا ہے بلکہ یہ ان سب سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے۔ پہلے حوادث خاص خاص خطوں میں رونما ہوا کرتے تھے اور متعین مسائل سے متعلق ہوتے تھے جنگ ہوتی تھی تو کسی خاص مقصد کے لئے ——— کبھی خام پیداوار کے لئے ——— کبھی خام مال کی منڈیوں کی تلاش میں۔ کبھی دفاعی مُوقف کی غرض سے۔ لیکن گذشتہ جنگ کو دیکھئے۔ اس کی ظلمت انسانی قلوب کی گہرائیوں میں دکھائی دے گی ——— نسلی تفاخر، تغلب و تسلط کے جذبات اور مملکت کے متعلق غلط فلسفہ۔

لہٰذا جو مصیبت ہمارے سامنے ہے اس کے متعلق ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے پہلے منظم شر کی قوتیں کبھی اس قدر زور آور نہیں ہوئی تھیں۔ اب تو ان سے نجات کا راستہ ہی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر ملک ویرانہ بن رہا ہے اور اس ویرانہ پر افلاس، امراض اور اموات کے شیاطین منڈلا رہے ہیں، . . . . نوعِ انسان اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں سے کھیلی جا رہی ہے، تباہ ہو رہی ہے۔

یہ تو ہے انسانی معاشرہ کی اجتماعی تباہ کاریوں کا تذکرہ۔ اس معاشرہ کے اندر خود فرد کی کیا حالت ہے۔ اس کے متعلق مشہور امریکی مفکر ممفورڈ لکھتا ہے کہ

ہم تاریخ میں اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں انسان خود اپنا بدترین دشمن بن چکا ہے۔۔۔۔۔۔ مغربی کلچر انسان کا ترجمان نہیں رہا۔ یہ انسان سے باہر کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور خود انسان کا دشمن ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس تہذیب کے خلاف اس سے شدید تر تنقید اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ علاوہ اس کے کہ اس کے ذریعے انسان اپنے اوپر آپ تباہیاں لا رہا ہے، اسے انسانی زندگی سے کچھ دلچسپی نہیں رہی۔

اس تہذیب کا ماحصل یہ ہوگا کہ اس قسم کے مشینی انسان پیدا ہوں گے جو نہ اپنے لئے آپ فیصلہ کر سکنے کے قابل ہوں گے اور نہ ہی زندگی کی شاہراہ متعین کر سکنے کے اہل۔

(THE CONDUCT OF LIFE)

ہمارے زمانے میں، علمِ تجزیۂ نفس (PSYCHO ANALYSIS) انسان کی اندرونی دنیا سے متعلق مسائل کی بنیادی وجوہات کے سلسلہ میں بڑی تحقیق کر رہا ہے۔ اس فن کے مشہور ماہر ڈاکٹر ینگ نے ہزارہا مریض نوجوانوں کے تجزیۂ نفس کے بعد ایک کتاب لکھی (MODERN MAN - IN SEARCH OF SOUL) وہ اس کتاب میں لکھتا ہے:-

عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ سے ہراساں۔ یعنی ان وحشی قوتوں کے مقابلہ میں جن پر وہ اپنے دور کی معاشی اور سیاسی تدابیر کے زور سے قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی دنیا کی حالت۔ اور اگر وہ اس اندھی دنیا سے جہاں تخریب و تعمیر کی قوتیں ہر وقت ترازو کے پلڑوں کو اٹھاتی جھکاتی رہتی ہیں، اپنے اندر کی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

یہ وہ تاریکیاں ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے، ابلیس کی زبان سے کہلوایا تھا کہ

تو نے کیا دیکھا نہیں، مغرب کا جمہوری نظام ‏ ‏ ‏ چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

خود اقبالؒ نے اس بدنصیب انسان کے قلبی اضطراب کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:-

وہ اپنے فکر کی دنیا میں خود اپنی ذات کے خلاف ستیزہ کار رہتا ہے، اور سیاسی دنیا میں دوسروں کے خلاف نبرد آزما ۔۔۔۔۔۔۔ اور نہ اپنی کف بدہاں سرکشی کو ضبط میں لا سکتا ہے، اور نہ ہی ہوس زر پرستی کی ناقابلِ تسکین تشنگی کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتا ۔۔۔۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو اس کے تمام بلند مقاصد کو (ایک ایک کر کے) تباہ کر رہی ہیں اور ایسی کیفیت پیدا کر رہی ہیں کہ وہ زندگی کے ہاتھوں بیزار ہے۔ وہ نگاہ فریب مناظر میں جذب ہو کر اپنی ذات کی گہرائیوں سے یکسر منقطع ہو چکا ہے۔ اس کی منظم مادہ پرستی کے میدان میں اس کی توانائی پر وہ فالج گر چکا ہے جسے ہکسلے کی نگاہ نے بھانپا اور اس پر اظہارِ تاسف کیا تھا۔

(خطبات - صفحہ ۱۸۷)

انہوں نے عصرِ حاضر کے انسان کی اس کیفیت کو بالِ جبریل میں دو مصرعوں میں اس طرح سمٹا کر بیان کیا

ہے کہ ؎

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی　　کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

میں چاہتا تو اس موضوع پر بیسیوں شہادات کا اضافہ کر سکتا تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایک تو اس لئے کہ قلتِ وقت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اور دوسرے اس لئے کہ یہ اخلاقی پستیاں، یہ تباہیاں اور بربادیاں، ہمارے لئے اب جگ بیتی نہیں رہیں، آپ بیتی بن چکی ہیں۔ یہ سب ہمارے ان کی روزمرہ کی زندگی کا معمول بن چکی ہیں جن کے ہاتھوں ہم میں سے ہر شخص نالاں ہے لیکن ان کا کوئی مداوا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لہٰذا مجھے، مزید شہادات پیش کئے بغیر آگے بڑھ جانا چاہیئے، یہ دیکھنے کے لئے کہ ان مفکرین کے نزدیک، ان تباہیوں کا بنیادی سبب کیا ہے، یہ بڑے غور سے سننے اور سمجھنے کے قابل ہے۔

میس مفکر، سٹیس نے اپنی ایک کتاب (فلاسفی اوف ریلیجن) میں ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> یہ ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق تاریخ سے کی جا سکتی ہے کہ جب کبھی سائنٹیفک زاویۂ نگاہ میں کوئی بڑی تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ایسے مفکر پیدا ہو جاتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ بنیادی اور ابدی صداقتوں میں بھی اسی زاویۂ نگاہ کے مطابق تبدیلی پیدا کر دی جائے ۔۔۔ جب اٹھارویں صدی میں نیوٹن کے نظریہ کے ماتحت خارجی کائنات کے متعلق ایک نیا تصور قائم ہوا تو اس کے ساتھ ہی اس کا بھی تقاضا شروع ہو گیا کہ اب دنیا کو مذہب بھی نیا ملنا چاہیئے چنانچہ اس کے مطابق ایک نیا مذہب بھی پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے تقاضا کیا کہ اخلاقیات، ادب اور مابعد الطبیعیات کو اپنے بنیادی اصول اور جوہر بدل لینے چاہئیں تا کہ وہ اس سائنٹیفک زاویۂ نگاہ کے مطابق ہو جائیں۔　(P. 7)

سٹیس نے تو نیوٹن کی مثال دی ہے۔ خود ہمارے زمانے میں جب آئن سٹائن نے نظریۂ اضافیت (RELATIVITY) پیش کیا تو مسٹر بارکٹ نے کہا تھا کہ اخلاقیات کو بھی اضافی ...... (RELATIVE) ہونا چاہیئے، نہ کہ مطلق (ABSOLUTE) بالفاظِ دیگر بات یہ کہی گئی کہ، خارجی کائنات کے متعلق سائنس کے انکشافات جو تصور پیش کریں، اخلاقی اقدار کو بھی انہی کے مطابق ڈھلتے اور بدلتے رہنا چاہیئے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں یورپ میں مادہ (MATTER) کے متعلق بڑے وسیع پیمانے پر سائنسی تحقیقات ہوئیں۔ انہی میں نظریۂ ارتقا (THEORY OF EVOLUTION) بھی تھا۔ یہ نظریہ اس حد تک تو صحیح تھا کہ زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، اوّلین جرثومہ سے درجۂ حیوانات تک پہنچی ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ بھی کہا گیا کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح صرف طبیعی جسم سے عبارت ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اس کا دماغ، دیگر حیوانات کے مقابلہ میں ذرا بڑا ہے، اس لئے اس میں عقل و شعور کی صلاحیت نسبتاً زیادہ ہے۔ اس سے زیادہ انسان اور دیگر حیوانات میں کوئی فرق نہیں۔ اس

کی زندگی بھی طبعی قوانین کے تابع ہے ——— یہ بھی عام حیوانات کی طرح، کھاتا پیتا۔ افزائش نسل کرتا ہے۔

اس کا سبب

اور اس کے بعد موت اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس باطل نظریہ کا اثر، انسانی زندگی پر کیا پڑا، یہ چیز قابلِ غور ہے اور موجودہ عالمگیر انسانی تباہیوں کا بنیادی سبب۔ حیوانات کا مقصد اپنے آپ کو زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے انہیں طبعی سامان زیست (کھانے پینے کی چیزوں) کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان ضروریات کے پورا کرنے کے لئے ان ...... کے سامنے جائز اور ناجائز کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ (مثلاً) ایک بھینس کا بیل باہر جاتا ہے تو جو کھیت سب سے پہلے اس کے سامنے آئے وہ اسی میں سے چرنے لگ جاتا ہے، بلاتمیز اس کے کہ وہ کھیت اس کے مالک کا ہے یا کسی اور کا ——— اپنے کھیت اور دوسرے کے کھیت کی یہ تمیز، انسانی سطح کا خاصا ہے، حیوانی زندگی میں یہ امتیاز ہوتا ہی نہیں۔ اسی تمیز و تخصیص کو "جائز اور ناجائز" میں فرق کیا جاتا ہے اور اسے اصطلاح میں قدر یا (VALUE) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اقدار کا تصور انسانی سطح کا خاصا ہے۔ حیوانات میں یہ چیز مفقود ہوتی ہے۔ وہ، اقدار کے تصور سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ یورپ کی سائنسی تحقیقات نے یہ تصور پیدا کیا کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح ایک حیوان ہے۔ اس نظریہ کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کے سامنے اقدار کا تصور نہ رہا۔ اس نے بھی زندگی کا مقصد، اپنی طبعی ضروریات کا پورا کرنا سمجھ لیا، اور بس۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

درنگاہش آدمی، آب و گل است کاروانِ زندگی بے منزل است

قرآنِ کریم نے اس نظریہ کو کفر کہہ کر پکارا ہے، اور اس کا نتیجہ جہنم۔ سورۂ محمدؐ میں ہے:-

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۔ (47/12)

جن لوگوں کا تصورِ زندگی حیوانات کی طرح کھانا پینا اور دیگر سامانِ زیست سے متمتع ہونا ہے، اور بس۔ وہ کفر کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس زندگی کا نتیجہ جہنم ہے۔

اس آیت سے دو اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اقدار کا تصور، کفر اور اسلام میں مابہ الامتیاز ہے۔ جس زندگی کا مقصد محض طبعی ضروریات کا پورا کرنا ہے، وہ کفر کی زندگی ہے۔ اسلام کی زندگی وہ ہے جس میں اقدار کی پابندی مسلکِ حیات ہو۔ اور دوسری بات یہ کہ اقدار کو نظر انداز کر دینے سے جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ عذابِ جہنم میں مبتلا ہو گا ——— اس دنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی ——— اس دنیا کا جہنم آج ہم سب کے سامنے ہے۔

اقوامِ مغرب نے اپنے نظامِ سیاست کی بنیاد جس (جدید) نظریۂ حیات پر رکھی۔ اسے سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں مطلق اور غیر متبدل اقدار کا تصور نہیں ہوتا۔ اپنی تمدنی زندگی کے لئے معاشرہ

سیکولرازم

جس قسم کے قوانین چاہے مرتب کرلے۔ لیکن مارکس اس سے ایک قدم آگے بڑھا۔ اس نے اس حیوانی نظریہ پر اپنے معاشی نظام کی بنیاد رکھی جسے کمیونزم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ اخلاق و اقدار کے تمام تصوّرات، عہدِ پارینہ کی فرسودہ کہانیاں ہیں جو جہالت اور توہم پرستی کی پیدا کردہ ہیں۔ انسان کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے ——
فیورباخ کے الفاظ میں :-

(MAN IS WHAT HE EATS)

یعنی "انسان عبارت ہے اس سے جو کچھ وہ کھاتا ہے۔" (ESSENCE OF CHRISTIANITY)
خود مارکس نے اپنی کتاب (کیپیٹل جلد اوّل) میں لکھا کہ :-

اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعیات، اور اسی قسم کے دیگر نظریات کا آزادانہ وجود کوئی نہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ ان کا کوئی نشوو ارتقاء نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان اپنی مادی پیداوار اور مادی روابط کی نشوونما کے ساتھ ساتھ، اپنے خیالات، اور ان خیالات سے پیدا شدہ تصوّرات کو بدلتا رہتا ہے۔ (انہی کا نام عقائد و اخلاقیات اور اقدار ہیں)۔

مارکس کے رفیقِ اوّل، اینگلز نے کہا کہ
(ہمارے فلسفہ حیات کی رُو سے) دنیا میں کوئی شے حرفِ آخر، مطلق یا مقدس نہیں۔ کائنات کی ہر شے تغیّر پذیر ہے اور پیچھے سے آئی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

اور لینن نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ
ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی، تصوّر کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصوّر فریب ہے، دھوکا ہے۔ یہ تصوّر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے ....
سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق، احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے۔ ہم اسے مانتے ہی نہیں ...... ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کرکے رکھ دیں گے۔[1]

مختصر الفاظ میں، کمیونزم نے یہ تصوّر عام کیا کہ انسان کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے اور اس مسئلہ کا حل، تمدّن و سیاست کا بنیادی اور منفرد فریضہ ہے، خواہ وہ کسی طریق سے ہو۔ کمیونسٹ ممالک میں تو اس تصوّر

---

[1] ان اقتباسات کے حوالوں کے لئے، میری کتاب ' نظامِ ربوبیت ' ملاحظہ فرمایئے۔

کا عام ہونا فطری امر تھا، لیکن کمیونزم کے پراپیگنڈہ کا نتیجہ یہ ہے کہ جو ممالک کمیونزم کے مخالف ہیں، ان میں بھی یہ تصور عام ہو گیا ہے۔ یعنی اس وقت دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں انسانی زندگی کا سارا مسئلہ "روٹی، کپڑا اور مکان" نہ قرار پا گیا ہو۔ اس میں کمیونسٹ ممالک اور غیر کمیونسٹ ممالک۔ مسلم مملکتیں اور غیر مسلم مملکتیں۔ مغربی اقوام اور مشرقی اقوام، سب شامل ہیں ——— روٹی۔ روٹی۔ روٹی، ہر ایک کی زبان پر ہے۔ اقدار کا لفظ تک کہیں سنائی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مارکسزم بڑا کامیاب ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کا پیش کردہ نظریۂ حیات تسلیم اور اختیار کر لیا جائے۔ سو ایسا ساری دنیا میں ہو گیا ہے۔ سعدیؒ نے کہا تھا کہ

چناں قحط سالے شد اندر دمشق ... کہ یاراں فراموش کردند عشق

اُس قحط سالی میں تو معلوم نہیں کہ عشاق نے عشق فراموش کر دیا تھا یا نہیں۔ لیکن ہمارے زمانے نے تو اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ روٹی کے مسئلہ نے اتنی اہمیت حاصل کر لی ہے کہ عالمگیر نوعِ انسان یکسر اقدار فراموش ہو گئی ہے۔ آج نہ کسی کا روٹی سے بلند کوئی مطالبہ رہ گیا ہے، نہ دعویٰ کرنے والے روٹی مہیا کرنے کے سوا کوئی وعدہ کرتے ہیں۔ سوچئے کہ یہ رشتہ، کمہار اور اس کے گدھے کے رشتے سے ذرا بھی مختلف اور بلند ہے؟

اس میں شبہ نہیں کہ روٹی کا مسئلہ اپنی جگہ بڑا اہم ہے کیونکہ انسان کی طبیعی زندگی کا مدار اس پر ہے۔ لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ——— ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ بلند مقصد ہے غیر متبدل اقدار کا تحفظ۔

اقبالؒ کے الفاظ میں :-

نگہ خود را بہ چشم محرمانہ ... نگاہِ ماست مارا تازیانہ

تلاشِ رزق ازاں دادند مارا ... کہ باشد پیر کشودن را بہانہ (ارمغانِ حجاز)

اسی کا مفہوم اس نے اردو شعر میں اس طرح بیان کیا تھا کہ

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ... جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اگر روٹی کا مسئلہ مقصود بالذات بن جائے تو یہ (قرآن کی رو سے) کافرانہ تصورِ حیات ہو گا جس کا نتیجہ جہنم ——— اس سے انسان، حیوانی سطحِ زندگی پہ آ گرے گا جس میں "جنگل کا قانون" مسلکِ حیات قرار پا جائے گا۔ یہی وہ مسلکِ حیات ہے جس سے آج ساری دنیا کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ :-

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد ... دانہ ایں می کارد آں حاصل برد!

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است ... از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است
پردۂ آدم دری، سوداگری است! (پس چہ باید کرد)

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ موجودہ عالمگیر تباہی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انسان، حیوانی سطحِ زندگی اختیار کر چکا ہے جس کی وجہ سے بلند انسانی اقدار کا تصور گم ہو گیا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احساس خود اقوامِ مغرب کے مفکرین کو بھی ہو رہا ہے۔ لارڈ سنل (جس کی کتاب کا اقتباس شروع میں پیش کیا جا چکا ہے) موجودہ دور کی تباہ کاریوں کا تفصیل تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ

> ریب و تشکیک اور اخلاقی اقدار کی شکست کا اندوہناک احساس، انسانی قلوب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

اخلاقی اقدار کا ابدی اور غیر متبدل ہونا ضروری ہے۔ اس قسم کی اقدار صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہیں اور وحی اپنی منزہ شکل میں آج، اس آسمان کے نیچے، قرآنِ مجید کے سوا کہیں نہیں۔ لہٰذا، تباہیوں کے موجودہ جہنم سے نکلنے کے لئے سب سے پہلی شرط، ان اقدار کی صداقت پر یقینِ محکم ہے۔ اسے اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ ایمان کی اہمیت کس قدر ہے، اس کے لئے مغربی مفکر الفریڈ کوبن کی یہ شہادت سامنے لائیے کہ

> جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ انسان، ایمان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے اسے دورِ حاضر کے نوجوانوں کی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو اس تلاش میں مضطربانہ پھر رہے ہیں کہ کوئی ایسی شے مل جائے جس پر ایمان لایا جائے۔[1]

ایمان کے لئے انسان کی اس مضطربانہ تلاش کی کیفیت کیا ہے، اس کے لئے مغرب کے مشہور فلاسفر پیسکال کے یہ الفاظ گہری توجہ کے محتاج ہیں۔ اس نے لکھا ہے:۔

> انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے اور اسی طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ جب اسے ایمان، اور محبت کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بیکار اور خراب مقاصد پر ریجھ جاتا ہے۔ خلا، قدرت کے کارخانے میں محال ہے۔ اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے دست کش ہو جائے تو بُرے راستے اس کو خوش آتے ہیں۔ .... وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش، وہ موت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ یہ اقدار، قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ مسلم اقوام ہوں یا غیر مسلم، یہ اقدار کسی کے سامنے بھی نہیں۔ ان سب کے نزدیک، اصل مسئلہ صرف

---

[1] ان حوالوں کے لئے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" دیکھئے۔

روٹی کا رہ گیا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلم اقوام میں سے ہر قوم ہی نہیں، ہر فرد اس کا مدعی ہے کہ قرآن پر اس کا ایمان ہے۔ تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مسلم اقوام نے بھی ان اقدار کو چھوڑ کر حیوانی (کافرانہ) زندگی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ یہ تو کھلا ہوا تضاد ہے! لیکن اس میں کوئی تضاد نہیں —— اصل یہ ہے

ایمان کسے کہتے ہیں؟

کہ جسے عام طور پر "ایمان" کہتے ہیں، درحقیقت وہ ایمان نہیں۔ لفظِ ایمان کا زبان سے ادا کر دینا ہے۔ قرآن کے الفاظ کو زبان سے دہراتے رہنے کا نام ایمان رکھ لینا فریبِ نفس ہے۔ اور ہم سب اسی فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔

آج کے رانجھے، آج کے مجنوں، سب لفظوں سے کھیلنے والے
بھول گئے محمل والے کو، وردِ زباں ہے، محمل محمل!

اس فریبِ نفس کے لئے ہم نے اپنی زبان میں ایک لفظ وضع کر رکھا ہے جو ہماری نگاہ کو حقیقت کی طرف آنے ہی نہیں دیتا۔ جس سے پوچھئے وہ کہہ دے گا کہ میں "خدا کو مانتا ہوں۔ خدا کی کتاب کو مانتا ہوں"۔ ہم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ اس "مانتا ہوں" کا مفہوم کیا ہے؟ غور کرنے پر نظر آ جائے گا کہ یہ صرف دو لفظ ہیں جنہیں دہرا دیا جاتا ہے۔ درحقیقت ان سے مقصود و مطلوب کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ پر ایمان کے معنی ہیں اس کے احکام کی اطاعت کرنا۔ اور اس کی کتاب پر ایمان کا مطلب ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ جس ایمان کی شہادت انسان کا عمل نہیں دیتا، اس ایمان کا کچھ فائدہ نہیں۔ قرآن کے الفاظ میں:-

لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا۔ (۶/۱۵۹)

جس شخص کے ایمان کے ساتھ عملِ خیر شامل نہیں ہوگا، اس کا ایمان اسے کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ (اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ کی بحث کا یہ موقع نہیں)۔

اقبالؒ کے الفاظ میں —— مردہ آن ایمان کہ ناید در عمل —— سمجھنے کی خاطر یوں کہیئے کہ ایمان، کیمسٹری کا ایک فارمولا ہے جس کے مطابق لیبارٹری میں عمل کر کے وہ نتیجہ پیدا کیا جائے گا جس کے لئے وہ فارمولا وضع اور مرتب ہوا تھا۔ اگر آپ اس فارمولا کو سنہری حروف میں لکھ کر حریر و اطلس کے جزدانوں میں لپیٹ رکھیں، یا صبح شام اس کے الفاظ کو دہراتے رہیں، تو کیا اس سے وہ نتیجہ مرتب ہو جائے گا؟ قیامت تک نہیں ہوگا۔ دعوئ ایمان بلا عمل کی یہی مثال سمجھئے۔ موجودہ مسلم اقوام کے دعوائے ایمان کی حالت کیا ہے؟ اس کے لئے مثالیں تو بہت سی دی جا سکتی ہیں لیکن میں یہاں صرف اس ایک مثال پر اکتفا کروں گا جو اس وقت

قتلِ مومن

ہم سب کے سامنے ہے اور جس نے ہمارے سینوں کو چھلنی کر رکھا ہے۔ سورۃ النساء کی یہ آیت کس مسلمان کے سامنے نہیں۔ جس میں کہا گیا

ہے کہ

وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (۴/۹۳)

جس مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اس کی لعنت۔ خدا نے اس کے لئے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ایک مسلمان کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان کے انفرادی قتل کو تو چھوڑ یئے۔ جس طرح مسلمان قومیں، ایک دوسرے کے قتل میں مصروف ہیں۔ (اور ظاہر ہے کہ جنگ میں قتل بالارادہ ہی ہوتا ہے) وہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان، باہمی قتال میں مصروف مسلمان قوموں کا قرآن مجید کی اس آیت پر ایمان ہے؟ میں کہتا ہوں کہ (سارے قرآن کو چھوڑ یئے) اگر مسلمان اقوام کا قرآن مجید کی اس ایک آیت پر ہی ایمان ہوتا، تو ہماری تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا!

یہ تو رہا ان مسلمان قوموں کے متعلق جو جنگ کے میدانوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہی ہیں وہ مسلمان قومیں جو خود تو شریک جنگ نہیں، لیکن ان لڑنے والوں کا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ وہ بھی یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب نہیں دے سکتیں کہ ہمارا قرآن پر ایمان ہے۔ ہم قتال کے جرم کی مرتکب نہیں۔ ان کے متعلق بھی قرآن کریم میں یہ ارشاد موجود ہے کہ

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (۴۹/۹)

اگر مسلمانوں کے کوئی دو گروہ باہمدگر نبرد آزما ہو جائیں تو تمہارا فریضہ ہے کہ تم آگے بڑھ کر ان میں صلح کرا دو۔

جو مسلمان قومیں، مسلمانوں کے ہاتھوں دوسرے مسلمانوں کے قتل کو خاموش بیٹھے دیکھ رہی ہیں، انہیں سوچنا چاہیئے کہ کیا ان کا قرآن مجید کی اس آیت پر ایمان ہے؟

عزیزانِ من! میں نے یہ مثالیں، صرف یہ بتانے کے لئے پیش کی ہیں کہ یہ کہہ دینا کہ ہمارا قرآن کریم پر ایمان ہے اور عملاً اس کے خلاف جانا، قرآن پر ایمان نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا آج، اقتدارِ خداوندی کو پسِ پشت ڈال کر محض روٹی کے مسئلہ کو مقصدِ حیات قرار دینے والی مسلمان مملکتیں بھی اسی طوفان میں بہے جا رہی ہیں جن میں دنیا کی غیر مسلم اقوام دستِ تلاطم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اور ہم سب اس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں جسے قرآن کریم نے اس منہج زندگی کا فطری نتیجہ قرار دیا تھا۔ جب تک ہم اقتدارِ خداوندی کی اہمیت کو سرِ فہرست نہیں رکھتے، معاشرہ کی جن تباہ کن خرابیوں کا ہم رونا روتے رہتے ہیں، ان میں کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لیجئے ؎

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

غیر مسلم قومیں تو پھر بھی کہہ سکتی ہیں کہ ہمارے پاس وہ غیر متبدل اقدار نہیں۔ سوچئے کہ مسلمان قومیں اس باب میں کیا کہہ سکتی ہیں؟

(○)

استبدالِ قومی

اب میں، ایک قدم آگے بڑھتا ہوں۔ قرآن کریم نے اُس قوم سے، جو اقدارِ خداوندی سے اعراض برتنے، یہ کہا تھا کہ

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)

اگر تم ان اقدار سے اسی طرح اعراض برتتے رہے، تو تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

یعنی ایسی قومیں جو ناقابلِ اصلاح حد تک پہنچ چکی ہوں، ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی قوم جو ان سے بہتر ہوتی ہے، انہیں صفحۂ زندگی سے الگ کر کے، ان کی جگہ لے لیتی ہے۔ ظاہر ہے استبدالِ قومی کا یہ پروگرام اسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے جب دنیا میں ایسی قومیں موجود ہوں جو اقدار کی میزان میں دوسری قوموں سے بہتر ہوں۔ لیکن موجودہ دور میں تو دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ اب تو دنیا کی کوئی قوم بھی ایسی نہیں جس کے ہاں اقدارِ خداوندی کا تصور غالب ہو اور وہ اس معیار کے مطابق دوسری اقوام سے بہتر ہوں۔ اس وقت تو کیفیت یہ ہے کہ ؎

خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار — سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس

بلکہ اس سے بھی آگے —— یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری —— میں جب اس حقیقت پر غور کرتا ہوں تو بڑی گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ ان حالات میں، جبکہ استبدالِ قومی کا یہ پروگرام ناقابلِ عمل نظر آتا ہے، مشیتِ خداوندی نہ جانے نوعِ انسان کی نجات کے لئے اور کونسا طریق اختیار کرے؟ قرآن کریم میں ایک مقام پر یہ بھی آیا ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ "اے نوعِ انسان کان کھول کر سُن لو کہ خدا تمہارا محتاج نہیں۔ تم اُس کے محتاج ہو۔ وہ قابلِ حمد و ستائش ذات، (تمام کائنات سے) مستغنی ہے"۔ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ۔ "وہ اپنے قانونِ مشیت کی رُو سے ایسا بھی کر سکتا ہے کہ تم سب کو لے جائے۔ (چلتا کرے) اور تمہاری جگہ ایک نئی مخلوق لے آئے"۔ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ۔ (۳۵/۱۵-۱۷) "خدا کے لئے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں"۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ موجودہ نسلِ انسانی کو معدوم کر کے، کرۂ ارض پر کوئی نئی مخلوق بسا دے۔ اس کے لئے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ لیکن قرائن، اور قرآن کریم کے دیگر مقامات سے مترشح ہے کہ اس سے موجودہ انسانوں کی جگہ کوئی دوسری مخلوق لے آنا مقصود نہیں بلکہ اسی نوعِ انسانی سے ایسے افراد، گروہ یا قوم پیدا کر دینا ہے جو سیرت و کردار کی رُو سے موجودہ اقوام سے

مختلف ہوں ـــــ اوّل تو اس لئے کہ نسلِ آدم ابھی اپنی بھرپور جوانیوں تک پہنچی ہی نہیں۔ انسان بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہے جن میں سے ہنوز عشرِ عشیر کی بھی نمود نہیں ہوئی۔ علامہ اقبالؒ نے اس نکتہ کی تشریح مختلف انداز و اسلوب سے کی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں: ؎

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

دوسرے مقام پر ہے: ؎

تو اُڑ جائے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز
گرچہ اُلجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

انسان کا مستقبل

اور پھر ان کے وہ چار مصرعے جن میں انہوں نے اپنے مخصوص، شوخ، دلآویز انداز میں حقائق کی ایک دنیا سمٹا کر رکھ دی ہے، انسان کے مستقبل کا بڑا حسین آئینہ ہے۔ کہتے ہیں: ؎

یکے در معنیٔ آدم نگر، از من چہ می پرسی!
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیر او پُر خوں شود روزے

انسان کی ذات کے ارتقاء کی وسعتیں اور رفعتیں تو ایک طرف، مادی زندگی میں بھی اس کی قوتوں کی نمود کا ابھی بھی آغاز ہوا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳)

اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے خدا نے تمہارے لئے تابعِ تسخیر کر دیا ہے۔ یعنی انسان میں تسخیرِ کائنات کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ ابھی تو ان صلاحیتوں کی نمود کا آغاز ہی ہوا ہے۔ اس پروگرام کی تکمیل میں نہ معلوم کتنے قرن درکار ہوں گے۔ باقی رہا اس کی ذات کا ارتقاء۔ سو اس کی وسعتوں کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ؎

عروجِ معنّی سے کم ستیزہ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں، سوز و گدازِ سجود! (اقبالؒ)

لہٰذا، نوعِ انسان نے کرۂ ارض پر ابھی بے شمار منازل طے کرنی ہیں۔ ابھی تو قرآنی نظام کے متعلق وہ دور آنا ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ: لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (۹/۳۳) "وہ نظام، انسانوں کے تمام خودساختہ نظاموں پر غالب آ جائے گا" ـــــ یہ اس زمانے میں ہوگا۔ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِينَ (۸۳/۶) "جب عالمگیر انسانیت خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے اُٹھ کھڑی ہوگی" ـــــ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹) "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔ یہ يَوْمُ الدِّينِ ہوگا" یعنی قرآنی نظام کا دور جس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ: يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا۔ اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا دستِ نگر، محکوم، محتاج یا "دربیل" نہیں ہوگا۔ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۸۲/۱۹) کیونکہ اُس وقت جملہ امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی رو سے ہوں گے۔ یہ دور اسی کرۂ ارض پر، نوعِ انسان کے ہاتھوں رونما ہوگا۔ لہٰذا، خدا کے پروگرام مشیّت

کے مطابق ایسا نہیں ہوگا کہ انسان اس سے پہلے ہی معدوم ہو جائے۔ جب تک قرآن موجود ہے، انسان معدوم نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن نوعِ انسان ہی کی راہ نمائی کے لئے ہے۔ کیا خوبصورت انداز ہے کہنے والے کا جس نے کہا ہے کہ

از صدِ سخنِ پیرم، یک حرف مرا یاد است — عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

لہٰذا، (ہمارے علم کی موجودہ سطح کے مطابق) "يَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ" میں خلقِ جدید سے مراد انسانوں سے الگ کوئی اور مخلوق نہیں۔ اسی انسان کا، اپنی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اور نمود، اور اقدارِ خداوندی کے مطابق اپنی داخلی دنیا میں تغیر کی رو سے "ایک نیا انسان" بن جانا مقصود ہے۔ لفظ خلق کے معنی "کثرتِ استعمال کے بعد کسی چیز کا صاف اور ہموار ہو جانا۔ اس میں صحیح صحیح تناسب اور اعتدال پیدا ہو جانا۔ اس کی مناسب تربیت ہو جانا" بھی ہیں۔ اسی کو عادات و اطوار یا خلق کہا جاتا ہے۔ اسی اعتبار سے حضور نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا کہ: إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (۶۸/۴) "اے رسول! یہ حقیقت ہے کہ تو خلقِ انسانی کے عظیم ترین مقام پر فائز ہے"۔ حضورؐ کی یہی زندگی ہے جسے نوعِ انسان کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ (۳۳/۲۱) اسی اسوۂ حسنہ کے اتباع سے، أَسْفَلَ سَافِلِينَ (انسانیت کی پست ترین سطح پر پہنچا ہوا آج کا انسان) "احسنِ تقویم" کا درخشندہ پیکر بن جائے گا۔ (۹۵/۴-۵) انہی افراد پر مشتمل وہ قوم ہو گی جو بگڑی ہوئی اقوامِ عالم کی جگہ لے گی۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے قوموں کی بعثت کے لئے بھی خَلَق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ۔ (۷/۱۸۱) "وہ لوگ جنہیں ہم نے ایسی قوم بنایا ہے، جو لوگوں کی راہ نمائی، الحق (زندگی خداوندی) کے مطابق کرتی ہے اور اسی کی رو سے ان کے اختلافی معاملات کا فیصلہ کرتی ہے"۔ یہی انسان کی وہ خلقِ جدید ہے جسے اقبالؒ آدمِ نو کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:

نقشِ دگر طراز دہ، آدمِ پختہ تر بیار — لعبتِ خاک ساختن می نسزد خدائے را

بلکہ اس سے بھی شوخ تر الفاظ میں کہ:

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل — کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

انہیں اسی آدمِ نو کے کچھ کچھ آثار ——— مفکرینِ مغرب کے افکار و تخیلات میں دکھائی دیتے تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے، پیامِ مشرق کے دیباچہ میں ان الفاظ میں کیا تھا:۔

یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے۔

آئن سٹائن کے مقابلہ میں، برگساں نے اس موضوع پر زیادہ وضاحت سے لکھا ہے۔ وہ اپنی آخری تصنیف

(THE TWO SOURCES OF MORALITY AND RELIGION) میں لکھتا ہے:-

آج نوعِ انسان، خود اپنی ترقی کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی کچلی ہوئی مصروفِ آہ و فغاں ہے یہ اس لئے کہ انسان کو اس کا احساس نہیں کہ اس کا مستقبل خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے اس کے لئے سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ انسان زندہ رہنا چاہتا ہے یا نہیں؛ پھر اس کے بعد یہ کہ انسان محض زندہ ہی رہنا چاہتا ہے یا اس سے آگے بڑھ کر فریضۂ کائنات کی تکمیل کے لئے بھی جدّ و جہد کرنے کو تیار ہے۔ فریضۂ کائنات کیا ہے؟ خدائی صفات کے حامل افراد کی تخلیق۔ (ص۳۱۶)

آپ اِس اقتباس کے آخری الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے۔ یعنی "فریضۂ کائنات کیا ہے؟ خدائی صفات کے حامل افراد کی تخلیق۔" کیا یہ قرآن کریم کی اس آیت کا گویا ترجمہ نہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (۲/۱۳۸)

خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے انسان کہ جس رنگ سے زیادہ حسین کوئی رنگ نہیں۔

جیسا کہ میں نے متعدد بار کہا ہے، انسان کے ہر تجربہ کی ناکامی، اُس کی فکر کا رُخ اُس سمت کی طرف موڑ دیتی ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے۔ قومیں خواہ کتنی ہی بگڑ چکی ہوں، ان میں ایسے افراد ضرور ہوتے ہیں جو زندگی کے حقائق اور صداقت کے متلاشی ہوں۔ اور یہ حقائق اور صداقت قرآنِ مجید کے سوا کہیں موجود نہیں۔ لہٰذا کوئی زمانہ بھی اس قسم کے افراد سے خالی نہیں ہوتا۔ قرآن زندہ حقائق کا ضابطہ ہے۔ اگر ان حقائق کی جستجو اور تڑپ کہیں نہ رہے تو دنیا میں قرآن کی موجودگی بے معنی ہو جائے۔ ایسا ہو نہیں سکتا ۔

دل ہوں گے، مگر تیری تمنا نہ رہے گی ۔۔۔ یہ وقت جب آئیگا، تو دنیا نہ رہے گی

آج ذرائع مواصلات کے عام ہو جانے کی وجہ سے، اس قسم کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ فکری رابطہ بھی پیدا کر رہے ہیں جس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک دن ایک گروپ کی شکل اختیار کر لیں گے۔ یہ ہوگا وہ گروپ جو باقی انسانوں پر تیزی کے ساتھ اثر انداز ہوگا۔ روسی مفکر اوسپنسکی کے استاد (یا گرو) گرجیف نے کہا تھا:-

انسانیت کا ارتقاء ایک مخصوص گروپ کی وساطت سے ہی عمل میں آ سکتا ہے۔ یہ گروپ باقی نوعِ انسانی پر اثر انداز ہوگا اور اس کی راہ نمائی کرے گا۔

(ALL AND EVERY THING, - PAGE 309)

بات یہاں سے چلی تھی کہ اس وقت دنیا میں کوئی قوم بھی ایسی نہیں جو قرآن کے معیار کے مطابق، باقی اقوام سے بہتر ہو۔ اس لئے استبدالِ قوی کا طریق تو ان حالات میں ممکن العمل نہیں۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ اس کے لئے دوسرا طریق یہ ہے کہ انہی اقوام میں سے، انسانی سطح پہ زندگی

بسر کرنے کے متمنی افراد ربطِ باہمی سے ایک ہم آہنگ گروپ کی شکل اختیار کر لیں۔ یہی وہ طریق تھا جس کے مطابق، صدرِ اوّل میں اصلاحِ انسانیت کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ ظہورِ نبویؐ کے وقت بھی دنیا میں کوئی ایسی قوم موجود نہیں تھی جو قرآنی معیار کے مطابق اپنی ہمعصر اقوام سے بہتر ہو۔ لیکن ایسے افراد موجود تھے جن میں تلاشِ حقیقت کی تڑپ تھی لیکن صحیح راستہ ان کے سامنے نہیں تھا، انہیں صحیح راستہ دکھایا گیا تو وہ بکھرے ہوئے افراد، نسل، رنگ، زبان اور وطن کی حدود و قیود سے بلند ہو کر، ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ اس طرح وہ اُمّت وجود میں آگئی جسے اُمّتِ وسطیٰ یا خیر اُمّۃ کہہ کر پکارا گیا۔ اس نے باقی انسانوں کی زندگی کو متاثر کیا اور اس طرح ان کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کی۔ یہ اُس دور کے "آدمِ نو" تھے۔ باقی نسلِ انسانی سے یکسر مختلف، اگرچہ طبعی اعتبار سے..... بَشَرٌ مِّثۡلُہُمۡ..... مجھے کچھ ایسا نظر آرہا ہے کہ موجودہ حالات میں، ایک نئی قوم پیدا کرنے کا وہی طریق پھر کارفرما ہوگا، اس فرق کے ساتھ کہ اس زمانے میں وہ مرکز، رسول اللہ کی ذاتِ گرامی تھی لیکن اب اس مرکزیت کے لئے کوئی رسولؐ یا مامور من اللہ نہیں ہوگا۔ ختمِ نبوت نے ماموریت من اللہ کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اب یہ افراد، باہمی مشاورت سے اپنی مرکزیت آپ قائم کریں گے۔ انسانی شعور اب اتنا بالغ ہو چکا ہے کہ اگر اسے صحیح راستہ مل گیا تو پھر وہ غلط موڑ نہیں مڑے گا۔ لہٰذا، اب کائنات کا یہ بگڑا ہوا نقشہ، قرآنی راہ نمائی کی روشنی میں عام انسانوں ہی کے ہاتھوں صحیح خطوط پر مرتب ہوگا۔ اس کے لئے کسی مامور من اللہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ پولینڈ کے فلاسفر (BERDYAEU) نے اس حقیقت کو اپنے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:-

> یہ دنیا ممکنات کی دنیا ہے۔ یہ مکمل شدہ جامد و ساکت نہیں۔ اس میں عملِ تخلیق جاری رہے گا۔ اور جو انسانوں کے ہاتھوں جاری رہے گا۔ اب انسان کو اپنی ممکنات سے خود پردہ کشائی کرنی ہوگی اور سرِ مضمر کو منصۂ شہود پر لا کے دکھانا ہوگا۔ یہ عملِ تخلیق، خدا کی طرف سے انسانوں کی طرف ہی نہیں آتا بلکہ خدا خود انسانوں سے تخلیقی جذبوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادی کا منتظر رہتا ہے۔[1]
>
> (THE DEVINE & THE HUMAN, - P.53)

ختمِ نبوت سے یہی مقصود تھا، یعنی، قرآنِ کریم کے الفاظ میں، ان زنجیروں کو توڑ کر جن میں انسان جکڑا ہوا چلا آرہا تھا، اور ان کے سر پر سے ان سِلوں کو اتار کر جن کے بوجھ تلے وہ کچلا جا رہا تھا، اسے وہ آزادی عطا کر دینا جس سے وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی پوری طرح نشو و نما کرنے کے قابل ہو سکے۔ یہی وہ آزادی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

---

[1] خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست (اقبالؒ)

قرآن کے الفاظ ہیں: وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ (۷/۱۷۶) ہم تو چاہتے کہ اسے، قرآن کے ذریعے آسمان کی بلندیوں کی طرف لے جائیں، لیکن یہ اپنے پست جذبات کے پیچھے لگ کر، زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس نَشْأَةً ثَانِيَةً: اس خلقِ جدید سے انسان، اپنی حیوانی زندگی کی خاک پیوندی سے دامن چھڑا کر شرفِ انسانی کی رفعتوں کی طرف گامزن ہو جائے گا۔ قرآن کے باقی اور محفوظ رکھنے سے یہی مقصود تھا۔

ابلیس کا چیلنج

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس قسم کے افراد ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں۔ ابلیس نے جب خدا کو چیلنج دیا تھا کہ تو نے آدم کو مجھ پر فضیلت تو دے دی ہے لیکن تو دیکھ کہ میں اولادِ آدم کو کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ تو اس کے جواب میں کہا گیا تھا کہ جو تیرے جی میں آئے کر دیکھ: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ (۱۷/۶۵) میرے بندوں پر تیرا غلبہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ اس "دام ودد" سے معمور کرۂ ارض کے جنگل میں یہ "عبادی" ہی وہ سعادت بخت انسان ہیں جنہیں ہم نے "آدمِ نو" سے تعبیر کیا ہے۔ رومی نے اسی قسم کے انسانوں کی تلاش کی جدوجہد کو اس قدر بلیغ اور دلآویز پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ اقبالؒ نے ان اشعار کو، اپنی پہلی تصنیف، اسرارِ خودی کے سرنامے کے طور پر درج کیا ہے۔ رومیؒ نے کہا ہے کہ: ؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست!

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما!

گفت آنکہ یافت می نشود، آنم آرزوست

(کل میں نے "شیخ" کو دیکھا کہ وہ دیا ہاتھ میں لئے، دن کی روشنی میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟ کہا کہ میں ان حیوانوں اور جانوروں سے تنگ آ چکا ہوں، اور کسی انسان کو تلاش کر رہا ہوں۔ یہ میرے سہل انگار رفیق! ان سے میں بہت دل گرفتہ ہوں۔ اور تلاش کر رہا ہوں کسی شیرِ خدا اور رستمِ داستاں کو!

میں نے کہا کہ میں نے بھی بہت تلاش کیا ہے لیکن ایسا انسان مجھے نہیں ملا — یہ جنسِ نایاب ہے۔

کہنے لگے کہ اسی نایاب جنس ہی کی تو مجھے تلاش ہے۔)

اسی جنسِ نایاب کی تلاش میں خود اقبالؒ بھی عمر بھر مصروفِ تگ و تاز و مشغولِ نے نوازی رہا۔ ؎

غزل سرائیم و پیغامِ آشنا گویم — بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم

تلاشِ صادق شرط ہے، ڈھونڈنے والے کو یہ افراد مل سکتے ہیں۔ عالمگیر فساد کے زمانے میں، ان افراد کے ربطِ باہمی، اور مناسب تعلیم و تربیت کے لئے، داستانِ بنی اسرائیل میں ہمیں ایک اشارہ ملتا

ہے۔ جب وہ فرعونی استبداد کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مصر میں غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے اور حضرت موسےٰ وہاں پیغامِ انقلاب لے کر پہنچے تو آپ سے کہا گیا کہ : وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً " (۱۰/۸۷) " ان سے کہو کہ تم بحالاتِ موجودہ اپنے گھروں ہی کو قبلہ بنالو۔ اور وہاں اپنی تربیت شروع کردو"۔ ابتداءِ کار کے لئے یہ چھوٹا سا گروہ، وہ ذرۂ اولیں (FIRST CRYSTAL) بن جائے گا جس کے گرد اسی قسم کے دیگر افراد مرتکز ہونے جائیں گے۔ ان میں نصب العین کی وحدت، وجہ ہم آہنگی ہوگی۔ اس قسم کے گروپ کے متعلق (BRIGHTMAN) لکھتا ہے کہ

> یہ ان آزاد لوگوں پر مشتمل ہوگا جو ایک معقول اور قابلِ قدر نصب العین کے حصول کے لئے باہمی تعاون و تناصر سے کام لیں۔ وہ نصب العین جس کی بنیادیں خدا کے ایمان پر استوار ہوں۔ (A PHILOSOPHY OF RELIGION)

قرآنِ کریم انہی افراد کے متعلق کہتا ہے:۔

> يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (۳/۱۹۹)
>
> اے وہ لوگو! جو وحدتِ نصب العین کی صداقت پر یقین رکھتے ہو، اگر تم اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ تم میں سے ہر فرد، خود بھی ثابت قدم اور مستحکم رہے اور دوسروں کے لئے بھی اسی قسم کے ثبات و استحکام کا ذریعہ بنے۔ اور اس طرح تم سب ربطِ باہمی سے جادۂ ہدایتِ خداوندی پر گامزن رہتے ہوئے آگے بڑھتے جاؤ۔

میری تگ و تاز کا مقصد بھی عزیزانِ من! اسی قسم کے منتشر افراد کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے۔ وہ افراد جنہیں یہ یقینِ محکم ہو کہ انسانی مشکلات کا حل، قرآنِ مجید کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ اب میرا روئے سخن بالخصوص ان احباب کی طرف ہے جنہوں نے اس مقصد کو دل میں لئے میری دعوت کو درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔ اور وہ سوچتے ہیں کہ اس دعوت کے فروغ اور اس مقصد کے حصول کے لئے کیا کچھ کیا جائے۔ یہ جذبہ بڑا مبارک اور اس قسم کی کوششیں بڑی مستحسن ہیں۔ لیکن میں اس سلسلہ میں ایک وارننگ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ قرآنِ کریم، محض فکری وحدت کو کافی قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک حقیقی وحدت وہ ہے جو قلوب کی ہم آہنگی سے پیدا ہو۔ جو شخص محض ذہنی طور پر اس مقصد کو صحیح سمجھ کر اپنے آپ کو اس رشتہ میں منسلک کر لے گا وہ اس گروپ میں شامل تو ہو جائے گا لیکن صرف اتنے سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکے گی جسے قرآن اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ ۔ (۳/۱۰۲) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی دلوں کا آپس میں جڑ جانا ——— اور ایسا ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ کی فکر، آپ کے احساسات و جذبات کو متاثر اور متحرک نہ کرے۔ یاد رکھئے! تنہا فکر، عمل کی محرک نہیں ہو سکتی۔ عمل کے محرک جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔ جب مختلف

وحدتِ قلبی

افراد کے جذبات ایک جیسی فکر سے متاثر ہوں گے کہ رد عمل پیدا ہو گی اسی لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ وحدتِ افکار کی، بے وحدتِ کردار ہے خام ـــــــ اس قرآنی حقیقت کی اہمیت کو اب مغربی مفکرین بھی سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے ان کا سارا زور فکری ہم آہنگی پر ہوتا تھا۔ عصرِ حاضر کے مشہور مؤرخِ تہذیب (J.H. DENISON) نے ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے:۔

(EMOTION AS THE BASIS OF CIVILIZATION) اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ علامہ اقبالؒ جیسے عظیم مفکر نے اپنے چھٹے خطبہ کے شروع میں اس کتاب کا ایک طویل اقتباس دیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں (GEORGE FOOT MOORE) لکھتا ہے:۔

> تہذیب کی نشو ونما اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کسی مقصد کے حصول کے لئے جد وجہد کرے۔ اس قسم کا اتحاد، تنہا وحدتِ فکر کی بنا پر ممکن نہیں ہوتا۔ یہ اتحاد وحدتِ جذبات و احساسات سے ممکن ہوتا ہے جن سے انسانی فکر میں جذباتی تحرک پیدا ہوتا ہے اور وہ معتقدات اور مقاصد بن جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے مومنین کی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ: بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۹/۷۱) - وہ ایک دوسرے کے جگری دوست ہوتے ہیں، تو اس قسم کے تعلقات جذباتی وحدت کے بغیر ممکن نہیں۔ محض فکری وحدت سے آپ ہیں، گھڑی کے پرزوں کی طرح، میکانکی تعاون تو پیدا ہو جائے گا۔ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ کی کیفیت پیدا نہیں ہوگی۔ گھڑی کے پرزے ساری عمر محوِ گردش رہتے ہیں، لیکن رہتے ہیں ویسے کے ویسے ہی۔ بلکہ وہ گھس کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ارتقاء ..... نہیں ہوتا۔ فکری وحدت زیادہ سے زیادہ اسی قسم کے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ انسان کی داخلی دنیا میں تغیر پیدا نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ فکری اشتراک کے باوجود باہمی نزاعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ باہمی نزاع کی وجہ کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق مشہور روسی مفکر، اوسپنسکی لکھتا ہے کہ

> انسانوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلط فہمیاں اس لئے پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ مختلف جذبات کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر ان کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو وہ ایک دوسرے کو بالکل صحیح طور پر سمجھنے لگ جائیں۔
>
> (TERTIUM ORGANUM, - P. 200)

جذباتی وحدت

وہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں کہتا ہے کہ آپ دیکھئے۔ شراب پینے والے ایک دوسرے کے یار ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ شراب ان میں ایک جیسے جذبات پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح بھنگ پینے والے ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ کیونکہ برگِ حشیش ان سب کو ایک ہی قسم کے افلاک کی سیر کراتی ہے۔ لیکن شراب یا بھنگ کے نشے، ایک تو عارضی ہوتے ہیں، اور دوسرے ان میں، انسانی فکر معطل اور مسلوب ہو جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ جب

ان کا نشہ اُتر جاتا ہے تو وہ پھر حسبِ سابق ایک دوسرے کے دشمن یا مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم جن جذبات کو وحدتِ فکر کی بنا پر ہم آہنگ کرتا ہے، ان میں یہ نقص نہیں ہوتا ـــ نہ وہ عارضی ہوتے ہیں، اور نہ ہی ان میں فکر مسلوب یا معطل ہوتی ہے۔ بلکہ وہ فکر کو اور جلا دیتے ہیں۔ جن خوش بخت افراد میں اس قسم کی فکری اور جذباتی وحدت پیدا ہو جاتی ہے، قرآن مجید، ان کی زندگی کو جنتی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس جنتی معاشرہ میں داخل ہونے والوں کی اوّلین خصوصیت یہ ہوگی کہ: وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ۔ (۷/۴۳) ان کے دلوں سے غلّ نکال دیا جائے گا۔ یہ لفظ (غلّ) ہے تو بہت چھوٹا سا لیکن معانی اور مفہوم کے اعتبار سے یہ بہت وسیع ہے۔ بات سمجھنے کے لئے یوں کہیے کہ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ اس کے دل میں میرے خلاف گرہ بیٹھ گئی ہے جو نکلنے میں ہی نہیں آتی۔ غلّ کے بنیادی معنی اسی قسم کی گرہ سمجھ لیجئے۔ اور اس گرہ سے ایک دوسرے کے خلاف، کینہ، کدورت، حسد، انتقام، عداوت کی جو زہر آلود خباثتیں پیدا ہوتی ہیں، ان سب کو اس میں شامل کر لیجئے۔ یہ ہے مفہوم غلّ سے۔ جنتی معاشرہ کی

جنتی زندگی

اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والے افراد کے دلوں میں کوئی غلّ نہیں ہوگا۔ اسے جنّت میں داخل ہونے سے پہلے ہی دُور کر دیا جائے گا۔ یہ گرہیں کھول دی جائیں گی ـــ اسی کیفیت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ (۱۵/۴۷)

اس کا عام ترجمہ تو یہی ...... ہے کہ "وہ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی طرح بیٹھیں گے۔" لیکن لفظ سُرُرٍ کا مادہ (س - ر - ر) ہے جس کے بنیادی معنی راز کے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے (FACE TO FACE) وہی بیٹھ سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی راز کی بات نہ ہو۔ يُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا۔ (۲۵/۷۵) وہ جب ایک دوسرے کو ملیں گے تو زندگی بخش سلامتی کی آرزوؤں کے ساتھ ایک دوسرے کو خوش آمدید کہیں گے۔ یہ وہ جنتی معاشرہ ہوگا جو قرآنی رفقاء پر مشتمل ہوگا۔ اس کے برعکس، جہنمی معاشرہ میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: لَا مَرْحَبًا بِهِمْ۔ (۳۸/۵۹) وہ منافقت اور ریاکاری سے ایک دوسرے سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں لیکن دل سے کبھی خوش آمدید نہیں کہتے۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر کبھی خوش نہیں ہوتے اس لئے کہ ان کے دلوں میں غلّ مچلا ہوتا ہے۔

اس غلّ کے نکالنے میں عزیزانِ من! ایک اور بھی عمیق نکتہ مضمر ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، غلّ کے معنی ہیں دل میں پڑی ہوئی گرہ۔ اور انتزاع کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اکھیڑ کر یا کھینچ کر نکالنا۔ جیسے پھانس نکال دی جاتی ہے۔ دورِ حاضر کے جہنمی معاشرہ میں اعصابی بیماریاں عام ہیں۔ ان سے جو اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمارا شب و روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ان کیفیات کو جسمانی امراض قرار دے کر ان کے بیسیوں علاج سوچے گئے لیکن ان میں سے کوئی بھی کارگر

ثابت نہ ہوا۔ اب ماہرین علم النفس (PSYCHOLOGISTS) اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جسمانی امراض ہی ہی نہیں۔ انسان کے تحت الشعور میں کوئی ایسا راز گھر گیر ہو جاتا ہے جسے اس کا شعور فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ گہرائی میں جا چھپا ہوا یہ راز، پھانس کی شکل اختیار کر لیتا ہے ——— پھانس یوں تو کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن اس کی پیدا کردہ بے چینی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ انسان کو لمحہ بھر کے لئے چین نہیں لینے دیتی۔ اب ان تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کا علاج تجزیہ نفس کی رو سے کیا جاتا ہے۔ اس فن کا ماہر کرتا یہ ہے کہ مریض کے تحت الشعور میں چھپے ہوئے راز کو کسی نہ کسی طرح "کھینچ کر" باہر لے آتا ہے اور مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ (بالخصوص امریکہ) میں اب یہ طریق علاج زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اعصابی مریض ہیں بھی زیادہ وہیں۔ ایسا کس کس طریق سے کیا جاتا ہے، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مریض کا اپنے معالج پر کلی اعتماد ہونا چاہیئے۔ یہی اعتماد ہے جس کی بنا پر، یہ معالج اس پھانس کو باہر نکال لیتا ہے۔

اس کے بعد پھر آیئے قرآن کریم کی اس آیۂ جلیلہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ: وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ۔ (۷/۴۳) ان کے تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کو نکال باہر کیا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جنتی معاشرہ کے افراد میں باہمی اعتماد کی کیفیت یہ ہوگی کہ شعوری راز تو ایک طرف، تحت الشعور میں جاگزیں سرِ مستور بھی ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ یہ کیفیت ہوگی ان کے شرحِ صدر کی۔

عزیزانِ من! اگر آپ کے باہمی تعلقات کی کیفیت ایسی ہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ یہ تعلقات قرآنی رابطہ سے استوار ہیں۔ اگر ایسی کیفیت نہیں تو آپ کا ربط باہمی محض فکری اور میکانکی ہے۔ اس سے میکانکی نتائج تو مرتب ہو سکتے ہیں۔ قلب و نظر میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ آپ ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ آپ جو قرآنی رابطہ کی بنا پر ایک گروپ بننے کے مدعی ہیں، آپ کا یہ رابطہ کس زمرے میں آتا ہے! ——— قلبی یا محض میکانکی؟

مجھے اس کا علم و احساس ہے کہ آپ احباب جو فکری طور پر اس تنظیم سے وابستہ ہوئے ہیں، تو آپ نے تقلیداً ایسا نہیں کیا۔ آپ نے پورے غور و خوض کے بعد اپنی سابقہ (غلط) روشوں کو چھوڑ کر علیٰ وجہ البصیرت اس راستے کو اختیار کیا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ آپ کا ہر قدم یہ آواز دیتا ہے کہ: ؎

حرم کو چھوڑ کے پھر حرم کہاں جاؤں   کہ میں تو دیر و کلیسا سے ہو کے آیا ہوں

اس کے باوجود یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ اس فکری راستہ سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں ——— یہ بھی دیکھیں کہ آپ کی سیرت و کردار میں وہ تبدیلی پیدا ہوئی ہے یا نہیں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اگر آپ کے قلوب ایک دوسرے سے جڑ گئے ہیں تو پھر سمجھئے کہ قرآنی رابطہ کا مقصد پورا ہوا ہے، ورنہ نہیں۔

لیکن اس کے بعد بھی آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ آپ باقی مسلمانوں سے الگ کوئی ممتاز افراد بن گئے ہیں — یاد رکھیئے۔ اپنے آپ کو "حقیقی" اور دوسروں کو "پیدائشی" مسلمان سمجھنا۔ یا اپنے آپ کو صالح اور باقی مسلمانوں کو غیر صالح قرار دینا، انانیت کے نفسیاتی مرض کا مظہر ہے جو احساسِ کمتری سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ـــــ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔ (۵۳/۳۲)

اپنے آپ کو یونہی مزکی نہ سمجھ لیا کرو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اپنے آپ کو پستیوں میں گرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو الیحق کے اس قسم کے وساس سے محفوظ رکھے۔ آپ کی سیرت و کردار کو ایسا ہونا چاہیئے جس سے دنیا خود اندازہ لگالے کہ آپ کیسے ہیں۔

فکری وحدت کے ساتھ جذباتی وحدت کی ہیں نے جو اسکیم سوچی ہے آپ میں ایک عرصہ سے قوم کے سامنے پیش کرتا چلا آرہا ہوں۔ یعنی قرآنک ریسرچ سنٹر اور قرآنک درس گاہ کا قیام۔ ریسرچ سنٹر، قرآنی حقائق کی فکری تحقیق کا فریضہ سرانجام دے گا۔ جہاں تک قرآنی درس گاہ کا تعلق ہے، اس میں نصاب کے ہر مضمون پر قرآنی روشنی میں تنقید سے، حق و باطل کو نکھار کر الگ الگ کیا جائے گا لیکن اس کا مقصد اسی پر ختم نہیں ہو جائے گا۔ ان طالب علموں کی تربیت قرآنی روشنی میں اس طرح کی جائے گی کہ قرآنی اقدار ان کے قلب کی آواز بن جائیں اور جب یہ اقدار ہر طالب علم کے دل کی گہرائیوں سے ابھریں گی تو اس سے ان میں قلبی یا جذباتی وحدت پیدا ہو جائے گی۔ قرآن کریم اسے اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ سے تعبیر کرتا ہے اس سے (مجھے امید ہے کہ) قرآنی سانچوں میں ڈھلے ہوئے وہ انسان ابھر آجائیں گے جن کی دنیا کو تلاش ہے۔

یہ بہرحال میری سکیم اور آرزو ہے۔ اس سکیم کی کامیابی اور میری اس آرزو کی برومندی کا انحصار توفیق ایزدی پہ ہے۔ میرا فریضہ بہرحال اس کے لئے کوشش کرنا ہے۔ سو وہ میں (بعونہٖ تعالیٰ) کئے جاؤں گا ـــــ اور اس کے بعد جو مرضی ہو بندہ پرور کی۔

یہ اسکیم جن مراحل سے گذری ہے اور اس وقت جس منزل میں ہے، اس کی تفصیل، سیکرٹری احباب کو اپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے اس بیان میں ملے گی جو طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۸۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مراحل بڑے صبر آزما ہیں لیکن میں ان کا عادی ہوں، اس لئے مایوس نہیں۔ میرا فریضہ اپنی امکانی حد تک کوشش کئے جانا ہے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ؀

(٠)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔ جسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ، کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈر

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-	نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران میں متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں۔
لاہور	جمعہ ٹھیک ۸ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰	
لنڈن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	149 SUTTON COURT RD. LONDON (E-13-9NR) PHONE-01-552-1517	
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 60, HERICK RD SALTLEY, B8 INT.	
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا سنیچر شام ۶ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1	
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE. #311, DOWNS VIEW. TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827	
کراچی ۱	ہر جمعہ ٹھیک ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ ۲۳ ہارون چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون ۲۳۸۸۲۸	
پشاور	(۱) ہر جمعہ ۵ بجے شام (۲) ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیق لین صدر (OPP: VIP. MAINGATE) پشاور سٹیڈیم بائی روڈ۔ فون ۷۲۶۵۹ / بیرونی نعمت کدہ۔ یونیورسٹی روڈ۔ جہانگیر آباد۔	
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف محمود علی صاحب۔ اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ	
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ	
لیّہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر میکینیکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید چوک (لیّہ)	
ایبٹ آباد	ہر اتوار ۴ بجے شام	دفتر غلام مصطفیٰ اعوان ایڈووکیٹ	
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی مکان نمبر ۲۔ نظامی منزل	
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ "غنی پورہ" باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب	
چکوال	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر، محلہ ہجویری مسجد۔ نزد تحصیل آفس، باہتمام محمد صفدر ملک صاحب	
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب	
گوجرانوالہ	ہر جمعہ ۵ بجے شام	دفتر بزم بلحق رہائشگاہ :- چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ۔ سول لائنز	
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام - ۱۲/۱/۱ بی کچہری روڈ۔۔۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ۔	
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)	
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۳۱۰۷۱)	
پنجکسی (تحصیل کبیر والا ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام، مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)	
ہنگو	ہر جمعہ ٹھیک ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۶۲)	
فیصل آباد	ہر جمعہ ۳ بجے بعد دوپہر	بمقام - حیات سرجری کلینک ۲۲/۲۳ پیپلز کالونی ۱ (فون ۲۲۸۵۵)	

علامہ محمد اسلم جیراجپوری
(نوشتہ ۱۹۳۰ء)

وضع حدیث

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید کے ساتھ فرمایا تھا کہ "جو شخص میرے اوپر قصداً جھوٹ بولے وہ جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنالے"۔ یہ حدیث اتنے صحابہؓ سے مروی ہے کہ بعض بعض ائمہ حدیث نے اس کے متواتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن باوجود اس وعید کے ..... ایسے لوگ تھے جو اسی زمانے سے جھوٹی حدیثیں گھڑنے لگے۔ ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں امام طبرانی کی اوسط اور ابن عدی کی کامل کے حوالے سے لکھا ہے کہ مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر بنی لیث میں کسی شخص نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا۔ جس کو اس عورت کے سرپرستوں نے نامنظور کر دیا۔ وہ شخص حلّہ نبوی[1] کے مشابہ ایک لباس پہن کر وہاں گیا۔ اور کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ حلّہ عطا فرمایا ہے اور اختیار دیا ہے کہ میں تمہاری عورتوں کے بارے میں جو چاہوں حکم دوں۔ ان لوگوں نے کہا کہ رسولؐ کا فرمان سر آنکھوں پر۔ یہ کہہ کر اس کو ایک مکان میں ٹھہرایا۔ اور اپنے دو آدمی تصدیق کے لئے دربارِ رسالت میں بھیجے۔ آں حضرت سن کر نہایت برہم ہوئے اور ایک انصاری کو حکم دیا کہ جا کر اس کو قتل کر کے آگ میں جلا دو۔ جب وہ انصاری وہاں پہنچے تو دیکھا کہ سانپ کے کاٹ لینے سے وہ مر چکا تھا۔ انہوں نے اس کی لاش کو آگ میں جلا دیا اور واپس چلے آئے۔

شیخ طاہر جزائری اپنی کتاب 'توجیہ النظر الی اصول الاثر' کے صفحہ ۲۴۶ میں لکھتے ہیں:۔

وقد کذب علی رسول اللہ علیہ وسلم وھوحیٌ قد کان فی عصر الصحابۃ منافقون و مرتدون۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر آپ کی زندگی ہی میں جھوٹ بولا گیا اور زمانہ صحابہؓ میں منافقین و مرتدین تھے۔

عہدِ صحابہؓ: صحابہ کرامؓ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ

---

[1] یہ ٹکڑا اضافی نظر آتا ہے۔ (طلوع اسلام)

لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئاً غیرہ فلیمحہ۔
مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو اُس کو مٹا ڈالے۔

علماء نے اس کی توجیہ یہ لکھی ہے کہ قرآن کی حفاظت کے لیے یہ حکم دیا تاکہ کوئی دوسری چیز اس کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے۔ لیکن درحقیقت یہ وجہ نہ تھی، ورنہ آپ یہ حکم دیتے ... کہ قرآن کو الگ لکھو اور روایتوں کو الگ۔ بلکہ مقصد اس ممانعت کا یہ تھا کہ لوگ روایات میں نہ پڑ جائیں، کیونکہ جب روایت کا سلسلہ چلتا ہے تو بیچ کے ساتھ جھوٹ بھی پھیلنے لگتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق خلیفۂ اوّل ہی کے عہد میں لوگ روایتوں میں اختلاف کرنے لگے اور جب انہوں نے دیکھا تو لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ آج تم روایات میں اختلاف کرتے ہو، ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے، اس لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہ کرو۔[1]

حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجموعۂ احادیث بھی لکھا تھا، جس میں تقریباً پانچ سو حدیثیں تھیں، مگر آخر میں اس کو حضرت عائشہؓ سے لے کر آگ میں جلا دیا، کیونکہ ان کو خیال ہوا کہ ممکن ہے میں نے کسی کو معتبر سمجھ کر کوئی روایت اس سے لکھ دی ہو اور درحقیقت وہ معتبر نہ ہو۔[2]

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس مجموعہ میں جملہ حدیثیں ایسی ہی تھیں کہ انہوں نے لوگوں سے سُن کر لکھی تھیں، کیونکہ وہ خود دربارِ رسالت کے رکنِ رکین تھے اور اپنے کان سے آنحضرتؐ کی باتیں سنتے تھے، جن میں اُن کو شبہ کی گنجائش نہ تھی، لیکن چونکہ روایات میں اختلاف اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور اُمّت کو بحیثیت خلیفۂ اسلام ہونے کے انہوں نے اس سے روک دیا تھا، اس لئے خود بھی پسند نہ کیا کہ روایات کا مجموعہ چھوڑ جائیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمروؓ بن عاص نے بھی کچھ فرمودۂ نبویؐ اپنے پاس لکھ رکھا تھا۔ لیکن یہ مجموعہ بھی کسی کو نہ ملا۔ معلوم نہیں کہ ضائع ہو گیا یا انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی طرح اُسے جلا دیا۔

ساری آفت منافقوں کی وجہ سے تھی جو سنتے کچھ تھے اور بیان کچھ کرتے تھے۔ آں حضرت کے بعد عہدِ صحابہؓ میں منافقین کے ساتھ مرتدین کی بھی جماعت تھی۔ اسی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے روایتِ حدیث کی ممانعت کی اور بعض معتمد صحابہؓ نے جو روایتیں کیں ان پر شہادت طلب فرمائی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد میں اور بھی سختی کی اور لوگوں کو روایت میں پڑنے سے منع فرمایا۔ اگر کوئی روایت بیان کرتا تو جب تک اس کے گواہ نہ لے لیتے نہ چھوڑتے، لیکن باوجود اس کے روایتیں پھیلیں اور کچھ لوگ اگر سچی روایتیں بیان کرنے والے تھے تو کچھ لوگ ایسے بھی تھے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ذکر ابی بکر۔ [2] تذکرۃ الحفاظ۔

جو جھوٹ گھڑنے لگے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ بشیر بن کعب نے حضرت ابن عباسؓ کے سامنے حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بشیر نے کہا کہ کیا بات ہے جو آپ میری حدیثیں نہیں سنتے۔ فرمایا کہ کبھی وہ زمانہ تھا کہ جب کوئی نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بات بیان کرتا تو ہم جھپٹ کر اس کی طرف بڑھتے اور کان لگا کر سنتے۔ مگر جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب یابس روایتیں شروع کیں، اس وقت سے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا۔

یہی وجہ تھی کہ اکثر صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم نے حدیثیں بیان کرنی چھوڑ دی تھیں۔ حضرت زید بن ارقمؓ سے ابن ابی لیلےٰ نے کہا کہ کوئی حدیثِ رسولؐ سنائیے۔ انہوں نے کہا کہ ہم بوڑھے ہو گئے اور بھول گئے۔ حضرت زبیرؓ سے ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے فرمائش کی کہ آں حضرت کی کوئی حدیث بیان کیجئے۔ انہوں نے بھی اسی طرح کا جواب دیا۔ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں حضرت سعد بن مالک کے ساتھ مدینہ سے مکہ تک گیا، مگر ایک روایت بھی نہ سنی۔ امام شعبی کا بیان ہے کہ میں حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں ایک سال تک رہا، لیکن انہوں نے کوئی حدیث بیان نہ کی۔ عہدِ صحابہؓ کے بعد سے کذابین اور وضاعینِ حدیث کی کثرت بڑھتی گئی۔

زمانہ مابعد

علامہ ابنِ جوزی کے بیان کے مطابق اس کے اسباب حسبِ ذیل تھے۔

۱- بعض لوگوں نے جن کے اوپر زہد غالب تھا، حفظ میں غفلت کی اور کچھ کا کچھ بیان کرنے لگے۔

۲- بعض اہلِ علم کی یادداشتیں ضائع ہو گئیں اور انہوں نے مجبوراً حافظہ سے روایت کی اور جو خیال میں آیا، کہہ گئے۔

۳- بہت سے ثقہ راویوں نے بھی جن کی عقلوں نے بڑھاپے میں جواب دیدیا تھا غلط روایتیں کیں۔

۴- ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے سہواً غلط روایت کی اور بعد میں باوجود اپنی غلطی کے علم کے بھی اس سے رجوع کرنا شان کے خلاف سمجھا۔

۵- زنادقہ نے شریعت کو مٹانے کے لئے جھوٹی حدیثیں گھڑیں۔

۶- جب مذہبی تفریق پیدا ہو گئی اور سنی، شیعہ، خارجی، قدری، جہمی، مرجعہ اور معتزلہ وغیرہ فرقے بن گئے۔ اس وقت ہر ایک فرقہ کے لوگوں نے دوسرے کے مقابلہ کے لئے اپنی اپنی تائید میں حدیثیں وضع کیں۔

۷- بہت سے عابد اور زاہد لوگ ایسے تھے کہ عوام کو کسی اچھے کام کی رغبت دلانے اور بُرے کام سے ڈرانے کے لئے حدیثیں گھڑتے تھے۔ ابن جوزی کے بیان کے مطابق یہ لوگ شریعت کو نامکمل سمجھتے تھے، جس کی تکمیل ان روایات سے کرتے تھے۔

۸- بعض لوگ ایسے بھی تھے، جن کا خیال تھا کہ ہر پسندیدہ قول کے لئے اسناد ترتیب دے لینا اور اس کو رسول اللہ تک پہنچا دینا جائز ہے۔

۹- سلاطین کے مقربین اور حاشیہ نشین ان کے حسبِ منشا روایتیں گھڑتے اور ان کو اپنے تقرب

کا ذریعہ بناتے تھے۔

۱۰۔ قصہ گو، واعظ اور مذکر طرح طرح کے افسانوں کو آنحضرت اور صحابہ کرام رض کی طرف منسوب کرتے تھے، کیونکہ ان کی گرمیٔ بازاری کا سرمایہ یہی تھا۔

یہ وہ دس وجوہ ہیں جن کے باعث مکذوب و مجہول روایتیں مسلمانوں میں پھیلیں۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر سیاسی جماعتوں نے جو دین کی راہ سے عوام کے قلوب کو مسخر کرنا چاہتی تھیں، حدیثیں بنائیں اور مشرق سے مغرب تک ان کو پھیلایا۔ اور ان سے بھی زیادہ ان لوگوں نے جو اپنے علم اور تقدس کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھانا چاہتے تھے، نئی نئی حدیثیں وضع کیں۔

شیخ محمد طاہر گجراتی اپنی کتاب تذکرۃ الموضوعات میں لکھتے ہیں کہ ایک محدث نے آخر عمر میں توبہ کی۔ اس وقت اس نے لوگوں سے کہا کہ ذرا دیکھ بھال کر حدیثوں کو قبول کیا کرو، کیونکہ ہم لوگ جب کسی بات کو اپنے حسب منشاء دیکھتے تھے، اس کو حدیث بنا لیتے تھے۔ (یعنی رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر دیتے تھے)۔

ان واضعین میں کچھ لوگ ایسے تھے جو مخفی طور پر جھوٹی حدیثیں اپنی جماعت میں پھیلاتے تھے۔ اگر ان کا پایۂ اعتبار کم ہوتا تھا تو بڑے بڑے بزرگوں کے ناموں سے ان کو روایت کرتے تھے۔ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ اپنے شیوخ کو غافل پا کر دسیسہ کاری سے اپنے مجعولات ان کی کتابوں میں درج کر دیتے تھے۔

اور کچھ لوگ علی الاعلان مکذوب روایتیں بیان کرتے تھے۔ کوئی تو اپنی گرمیٔ بازار کے لئے اور کوئی ثواب اور جہاد سمجھ کر۔ چنانچہ نوح بن ابی مریم نے قرآن کی ایک ایک سورۃ کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں، جن کو مفسرین اور خاص کر بیضاوی نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے۔ جب ائمہ حدیث نے ان کی تحقیق شروع کی تو اس نے اقرار کیا کہ میں نے یہ حدیثیں خود بنائی ہیں، تاکہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاؤں۔ یہی حال اکثر ان رواۃ کا تھا جنہوں نے ترغیب یا ترہیب کی حدیثیں روایت کی ہیں۔

واعظین اور قصہ گو تو نہایت بے باکی اور جرأت سے کام لیتے تھے۔ موضوعات کبیر میں ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین عہ نے مسجد رصافہ میں نماز پڑھی۔ وہاں ایک واعظ نے بیان کرنا شروع کیا کہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے عبدالرزاق سے، انہوں نے معمر سے، انہوں نے قتادہ سے، انہوں نے حضرت انس سے اور انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے، اللہ تعالےٰ اس کے اس کلمے کے ہر ہر حرف سے ایک ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی چونچ سونے کی ہوتی ہے اور پر زمرد کے، آخر تک قریباً بیس ورق کی حدیث بیان کی۔ اس طویل داستان کو سن کر ان دونوں نے آپس میں ایک دوسرے کو حیرت کے ساتھ دیکھا۔ اس کے بعد یحییٰ بن معین نے

عہ حدیث کے امیرالمؤمنین بولے جاتے ہیں اور ائمہ جرح و تعدیل میں ممتاز ہیں۔

واعظ کو اپنی طرف بلایا کہ یہ حدیث تم نے کس سے سُنی ہے۔ اس نے کہا احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے۔ انہوں نے کہا کہ میں یحییٰ ہوں اور یہ احمد بن حنبل۔ ہم دونوں میں سے کسی نے آج سے پہلے اس روایت کو سنا تک نہیں۔ تم کو اگر جھوٹ ہی بولنا تھا تو ہمارے سوا کسی اور کا نام لیا ہوتا۔ اس نے کہا کہ میں سنتے سنا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے۔ آج تحقیق ہو گئی، پوچھا کہ یہ کیونکر، بولا کہ سترہ یحییٰ بن معین ہیں اور سترہ احمد بن حنبل، جن سے میں نے روایت کی ہے۔ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ دنیا میں ایک اکیلے تمہیں یحییٰ بن معین ہو۔ یہ سُن کر انہوں نے آستین منہ پر رکھ لی اور چپ چاپ چلے آئے۔

محمد بن عبداللہ کا قصہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ اس نے موصل میں پہنچ کر عجیب و غریب حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ علماء کو جب اس کی خبر ہوئی تو ان میں سے چند نے ارادہ کیا کہ جاکر اس کی تردید کریں۔ وہ مجمع میں سرگرم تقریر تھا۔ اس نے جب علماء کو آتے دیکھا تو معاملہ کو سمجھ گیا، فوراً حضرت جابرؓ سے ایک روایت بیان کرنی شروع کی کہ "قرآن کلام اللہ ہے اور غیر مخلوق"[1] اب عوام کے خوف سے ان علماء کو جرأت نہ ہوسکی کہ آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہیں۔

ذہبی نے میزان الاعتدال میں امام شعبی[2] کا بیان نقل کیا ہے کہ میں ایک مسجد میں نماز پڑھنے لگا۔ اس میں ایک دراز ریش واعظ کھڑا ہوا تقریر کر رہا تھا۔ اس نے اسناد کے ساتھ یہ روایت بیان کی کہ اللہ تعالےٰ نے دو صور پیدا کئے ہیں۔ ہر ایک دو دو بار پھونکا جائے گا۔ میں نے جلدی سے نماز ختم کر کے کہا کہ اے شخص! اللہ سے ڈر اور جھوٹی حدیثیں بیان نہ کر۔ صور تو صرف ایک ہی ہے۔ اس نے کہا کہ کیسا فاجر آدمی ہے، جو بڑے بڑے بزرگوں کی روایت کو جھٹلاتا ہے۔ اس کی زبان سے یہ نکلنا تھا کہ عوام مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مارنے لگے۔ اور جب تک مجھ سے اقرار نہ لے لیا کہ اللہ تعالےٰ نے تیس صور پیدا کئے ہیں۔ اس وقت تک نہ چھوڑا۔

ائمہ حدیث نے جب تنقید شروع کی تو ان واضعین و ضعفاء کے تراجم جمع کر کے کتابوں میں مدوّن کئے۔ چنانچہ علوم حدیث میں سے علم الضعفاء والوضاعین بھی ایک اہم علم بن گیا جس میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ چند مشہور کتب یہ ہیں:۔

کتاب الضعفاء	امام بخاری۔ متوفی ۲۵۶ھ
"	ابوعبداللہ برقی۔ متوفی ۲۴۹ھ
"	ابواسحٰق جوزجانی۔ متوفی ۲۵۹ھ

---

[1] اس زمانے میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی، جو عالم قرآن کو غیر مخلوق کہہ دیتا، عوام میں مقبول ہو جاتا۔ پھر اس کی کوئی بات قابل تردید خیال کی جاتی۔

[2] تابعین میں بڑے پایہ کے امام ہیں۔ حجاج کے زمانہ میں کوفہ میں تھے۔

کتاب الضعفاء	ابو جعفر عقیلی - متوفی ۳۲۳ھ
"	ابو نعیم استر آبادی - متوفی ۳۲۳ھ
"	ابو الفتح محمد - متوفی ۳۷۴ھ
"	ابن عدی - متوفی ۳۶۵ھ (یہ کتاب کامل کے نام سے مشہور ہے اور ۱۲ جلدوں میں ہے)۔
کتاب الضعفاء	ابن ابی حاتم (چھ جلدوں میں)

کثرتِ موضوعات

جب وضاعین کی اس قدر کثرت تھی کہ ان کے تراجم بارہ بارہ جلدوں میں لکھے گئے۔ تو ظاہر ہے کہ موضوع احادیث کی کسقدر کثرت ہوئی ہو گی۔ عقیلی کا قول ملا علی قاری نے موضوعاتِ کبیر میں نقل کیا ہے کہ زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں وضع کیں۔ تذکرۃ الموضوعات میں شیخ محمد طاہر گجراتی لکھتے ہیں کہ جوئباری، ابن عکاشہ اور محمد بن تمیم فاریابی نے دس ہزار سے زیادہ حدیثیں بنائیں۔ ابن ابی العوجاء کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب اس کو قتل کرنے کے لئے لے گئے تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں۔ جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بناتا رہا ہوں۔

روایات کا تو کیا ذکر ہے۔ بعض بعض وضاعین نے پوری پوری کتابیں روایت کی تصنیف کر ڈالیں جو اوّل سے آخر تک غلط تھیں۔ تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۵ میں ہے:-

کتبِ حدیث میں بعض کتابیں ایسی ہیں کہ ان کی جملہ روایات موضوع ہیں۔ من جملہ ان کے القضاعی کی کتاب ہے۔ پھر اربعون ودعانیہ۔ ان دونوں میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے۔ "وصایا علی" نامی کتاب میں بھی بجز پہلی حدیث کے باقی سب غلط ہیں۔ انس بصری کی مسند جو تین سو حدیثوں کا مجموعہ ہے۔ سرتاسر غلط ہے۔ ابن عدی نے لکھا ہے کہ موسیٰ بن جعفر نے اپنے آباء کی روایت سے جو حضرت علیؓ تک پہنچائی گئی تھی ایک کتاب نکالی جو ہزار حدیثوں کا مجموعہ تھی۔ اس کی تمام حدیثوں کو دارقطنی نے کہا ہے کہ یہ کتاب "علویات" جھوٹ اور افترا کا مجموعہ ہے۔ اللہ اس کے واضع پر لعنت کرے۔ اس نے جماع اور طریقہ جماع کے متعلق بھی حضرت علیؓ کے نام سے وصیتیں روایت کی ہیں۔

دیلمی نے لکھا ہے کہ ابو الفضل جعفر بن محمد حسینی کی کتاب العروس منکر اور غیر معتبر ہے۔ اور امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ابن اسحٰق بن ابراہیم نے اپنے باپ اور دادا کی روایت سے ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جو ہرگز اس قابل نہیں کہ اس سے حجت پکڑی جائے۔

کتبِ موضوعات

جب احادیث .... کی پڑتال شروع کی گئی۔ اس وقت ائمہ جرح و تعدیل نے جہاں کذابوں کا پتہ لگانے کی کوشش کی، وہاں ان کی روایتیں بھی چھانٹ کر نکالتے گئے۔ اور جو ان کے نزدیک حتمی طور پر موضوع ثابت ہو گئیں۔ ان کے

مجموعے تیار کر دیئے۔ ان میں سے جو کتابیں مشہور ہیں، وہ ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

کتاب الاباطیل	ابو عبداللہ الحسین ہمدانی۔ متوفی ۵۴۳ھ
الموضوعات الکبریٰ	ابوالفرج عبدالرحمٰن بن جوزی۔ متوفی ۵۹۷ھ (چار جلدوں میں)
کتاب الموضوعات	ابوالحسن کنانی۔ متوفی ۹۶۳ھ
مختصر الموضوعات	امام سفارینی
اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ	جلال الدین سیوطی
تذکرۃ الموضوعات	شیخ محمد طاہر۔ گجرات پاک پٹن کے مشہور ہندی محدث۔ مقتول ۹۸۶ھ
رسالتان فی الموضوعات	رضی الدین صغانی۔ متوفی ۶۵۰ھ
الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ	شیخ ابو عبداللہ محمد شامی۔ متوفی ۹۴۲ھ
	امام شوکانی یمنی۔ متوفی ۱۲۵۵ھ
کتاب المغنی	حافظ ضیاء الدین موصلی۔ متوفی ۶۲۳ھ
الموضوعات الصریحہ	عمر بن بدر
الکشف الالٰہی	محمد سندروسی۔ متوفی ۱۱۷۷ھ
تذکرۃ الموضوعات	ملا علی قاری۔ متوفی ۱۰۱۴ھ
اللؤلؤ المرصوع	محمد بن خلیل قاوقجی۔ متوفی ۱۳۰۵ھ

ان وضاعین اور موضوعات سے حدیث پر ایسی آفت آئی، جس کا اندازہ مشکل ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک تھی۔ اور حدیثیں بھی جو آپ سے روایات کی گئی ہیں، ان کا ۹۹ فی صدی مدنی زندگی سے متعلق ہے، جس کی کل مدت دس سال ہے اور ادھر وضاعین و کذابین کی ایک بے شمار فوج ہو گئی۔ جو دن رات حدیثیں گھڑنے میں لگی رہتی تھی۔ بلکہ ان میں سے بعض کا پیشہ ہی یہی تھا۔ ان ہزاراں ہزار وضاعین نے لاکھوں حدیثیں وضع کر ڈالیں، اور ان کو پھیلا دیا۔ اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں وہ تھوڑی سی حدیثیں جو بلا شبہ صحیح تھیں، اس طرح مخلوط ہو گئیں کہ بڑے بڑے نقادوں کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ اس دریائے کذب سے سچائی کے قطروں کو چن سکیں۔

تنقیدِ حدیث ائمہ حدیث نے جب حدیثوں کو پرکھنا شروع کیا اور صحیح اور غلط کو الگ الگ کرنے لگے اس وقت دو چیزوں کو سامنے رکھا۔ ایک خود حدیث کو، دوسرے رواۃ کو۔

موضوع حدیث کی شناخت کے لئے انہوں نے حسب ذیل اصول قرار دیئے:۔

۱۔ صحیح تاریخ کے خلاف ہو۔

۲- رافضی صحابہ کے یا خارجی اہل بیت کے مطاعن میں روایت کرے۔
۳- حدیث میں ایسا واقعہ ذکر کیا جائے، جس کے بیان کرنے والے بہت سے ہو سکتے ہوں مگر صرف ایک ہی شخص روایت کرتا ہو۔
۴- قرآن کے خلاف پڑے۔
۵- عقلِ صحیح کے خلاف ہو۔
۶- چھوٹے چھوٹے عمل پر بڑے بڑے اجر کا وعدہ یا چھوٹے چھوٹے گناہ پر بڑے بڑے عذاب کی وعید ہو۔
۷- قرینہ یا موقع کے خلاف معلوم ہوتی ہو۔

لیکن ان اصولوں سے صرف تھوڑی سی غلط اور موضوع حدیثیں پکڑی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ جو لوگ جھوٹی حدیثیں تراشتے تھے، وہ اس کے ہر پہلو پر نظر ڈال لیتے تھے تاکہ کوئی گرفت نہ کر سکے۔ چنانچہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود بڑے بڑے قانون دانوں کی جرح کے بھی جھوٹے گواہ اپنی شہادتوں میں پورے اتر جاتے ہیں اور کبھی کبھی سچے گواہوں سے زیادہ قابلِ اعتبار قرار پا جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ اصول غلط روایتوں کی پہچان کے لئے مقرر کئے گئے ہیں تقریباً بے کار ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ائمہ جرح و تعدیل نے دوسری چیز یعنی رواۃ کی ثقاہت پر زیادہ دارومدار رکھا، لیکن مشکل یہ ہے کہ ثقاہت ایک باطنی وصف ہے اس کی تمیز کی بنیاد کس پر رکھی جائے۔ رہا ظاہری تقویٰ اور طہارت تو اس کی بابت خود محدثین کا تجربہ بہت تلخ ہے۔ یحییٰ بن سعید القطان جو جرح و تعدیل کے عظیم الشان امام ہیں، کہتے ہیں کہ اہلِ صلاح و خیر سے زیادہ حدیث کے معاملہ میں کوئی جھوٹا نہیں ہوتا۔ امام مسلم کا قول ہے کہ اہلِ خیر کی زبان سے بلا ارادہ بھی جھوٹ نکلتا ہے۔

ایوب سختیانی نے اپنے ایک پڑوسی کے علم، زہد، عبادت و طہارت کی بہت تعریف کی، مگر اس کے بعد کہا کہ اگر وہ میرے سامنے ایک کھجور کے بارہ میں بھی کوئی شہادت دے تو میں قبول نہیں کرونگا۔[۱]

اس لئے مجبوراً رواۃ کی صداقت، ثقاہت اور عدالت کا مدار شہرت اور مقبولیت پر رکھا گیا، یعنی ان لوگوں کی روایت لی جائے جن کی ثقاہت اہلِ علم میں مقبول اور مشہور ہو۔

حدیثیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے دوسری صدی ہجری کے آغاز سے کتابوں میں لکھی جانے لگیں گو اس وقت بھی لوگ جانچ کرتے تھے مگر اصل تنقیدِ حدیث کا زمانہ تیسری صدی ہے۔ بیشتر ائمہ جرح و تعدیل اسی عہد میں ہوئے۔[۲] ان ائمہ میں بھی تسامح موجود تھا۔ تذکرۃ الموضوعات میں ہے:۔
ابن حنبل، ابن مہدی اور ابن مبارک، تینوں کا بیان ہے کہ ہم حلال اور حرام کی روایت کی جانچ

---

[۱] توجیہ النظر۔ صفحہ ۲۵۔
[۲] مثلاً احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، امام بخاری، مسلم اور ارباب سنن وغیرہ۔

میں سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ کی روایت میں نرمی۔
ملا علی قاری موضوعات میں لکھتے ہیں :-

هذا كله يظهر للمحدثين من حيث نظرهم الى الاسناد والا فلا مطمع للقطع - لتجويز العقل ان يكون الصحيح فى نفس الامر موضوعًا والموضوع صحيحًا۔

یہ سب کچھ وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آتا ہے، ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں، کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انہوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔

چنانچہ جملہ اصولیئین اور ائمہ محدثین نے صحیح سے صحیح حدیث کی صحت کو بھی ظنی مانا ہے، یقینی نہیں کہا ہے بجز متواتر کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے[1]۔ انہوں نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں، مثلاً قوی، صحیح، حسن، مقبول یا ضعیف، موضوع، منکر اور مردود۔ ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے ورنہ روایت کی تو صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، صحیح یا غلط۔

غرض حدیث کی جو تنقید ہوئی ہے، اس میں ابھی بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے۔ علامہ ابن جوزی نے جو حدیث میں کسی قدر متشدد تھے، اپنی کتاب الموضوعات الکبریٰ میں سنن اربعہ کی بہت سی حدیثوں بلکہ صحیحین یعنی بخاری اور مسلم کی بھی متعدد حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے۔ علماء نے رفع اِلزام کے خیال سے ان کی تردید کی، لیکن دلیل بجز اس کے اور کچھ نہ دی کہ یہ مُسلّم چلی آتی ہیں۔

حافظ ابن حجر جو باوجود اس کے کہ حدیث میں بہت نرم ہیں، لکھتے ہیں کہ ابن جوزی نے ابھی اس قدر موضوعات چھوڑ دی ہیں کہ ان کی کتاب کے برابر (یعنی چار جلد کی) ایک دوسری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

موضوعات کا اثر

اگرچہ ائمہ محدثین نے ان مکذوبات سے اُمّت کو بچانے کی کوشش کی، لیکن ان کا تسلط دوں پر اس قدر ہو گیا تھا کہ آج تک ہزاروں موضوع حدیثیں مسلمانوں کا دینی سرمایہ بنی ہوئی ہیں اور ان کے عقائد و اعمال میں دخیل ہیں۔

یوں تو باب الطہارت سے لے کر باب الحشر و النشر اور باب الجنتہ و النار تک ایک بھی ایسا نہیں ہے، جس میں موضوعات نہ ہوں، لیکن بعض ابواب ایسے ہیں کہ ان میں صرف موضوعات ہی ہیں یا انہیں کی کثرت ہے۔ مثلاً

صلاۃ تسبیح — ایک حدیث بھی صحیح نہیں۔

---

[1] شیخ طاہر جزائری لکھتے ہیں کہ وہ حدیثیں جن کو متواتر کہا گیا ہے، در حقیقت ان میں تواتر معنوی ہے۔ کیونکہ صحیح یہ ہے کہ کوئی حدیث متواتر نہیں ہے۔

صلاۃ حاجت — ایک حدیث بھی صحیح نہیں
صلاۃ السبوع — " " "
صلاۃ الفیہ — " " "

تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ بعض صوفیانہ کتابوں مثلاً ابوطالب مکیؒ کی قوت القلوب یا ثعلبی وغیرہ کی تفسیر کے سے جنہوں نے غلط فہمی سے نصف شعبان کی رات کو شبِ قدر کہہ دیا، لوگوں نے اس میں صلاۃ الفیہ جاری کی اور دس دس کی ٹولیوں میں سو سو رکعتیں پڑھنی شروع کیں اور عید سے بھی زیادہ شب برات کا اہتمام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس نے میلہ کی شکل اختیار کر لی، جس میں اس قدر فسق و فجور ہونے لگا کہ اولیاء اللہ بیابانوں میں نکل جاتے تھے، اس خوف سے کہ کہیں اللہ کا قہر نہ نازل ہو جائے۔ سب سے پہلے اس کا رواج بیت المقدس میں ۴۴۸ھ میں ہوا۔ پھر سارے شام اور مصر میں پھیل گیا۔ آخر میں علما و صلحین نے توجہ کی، جن کی کوشش سے یہ بدعت مٹ گئی، تاہم اس کا سلسلہ کچھ نہ کچھ آٹھویں صدی ہجری تک رہا۔ شیخ علی بن ابراہیم نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ شبِ برات میں روشنی کی ابتداء برامکہ سے ہوئی جو مجوسیت چھوڑ کر اسلام لائے تھے۔ انہوں نے دین اسلام کی راہ سے اپنی آتش پرستی کی رسم کو تازہ کیا۔ اسی نے رفتہ رفتہ آتش بازی کی شکل اختیار کر لی جو مغرب سے مشرق تک پھیل گئی۔

زیارتِ قبرِ نبیؐ — ایک حدیث بھی صحیح نہیں۔
فضائلِ ائمہ اربعہ — " " "
فضائلِ عرب و زبانِ عربی — " " "
مذمتِ عجم و زبانِ عجمی — " " "
فضائلِ ابدال و اوتاد و قطب و غوث — " " "

صوفیا کی کل مشہور حدیثیں موضوعات کی فہرست میں داخل ہیں۔ مثلاً

كنتُ كنزاً مخفياً فاحببتُ أن أعرفَ فخلقتُ الخلق۔

من عرف نفسه فقد عرف ربّه۔

رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر۔

اعداء عدوك نفسك التي بين جنبيك۔

ذرة من اعمال الباطن خير من الجبال الرواسي من اعمال الظاهر۔

القلب بيت الرب۔

ان لله سبعين حجاباً من نور۔ وغیرہ

علما اور متعلمین کے فضائل میں بھی تمام حدیثیں خود ساختہ ہیں۔ مثلاً

علماء کی سیاہی شہدا کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔

ایک فقیہ شیطان کے لئے ہزار عابد سے گراں تر ہے۔
علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں۔ یا میری اُمت کے علماء بمنزلہ انبیاءؑ بنی اسرائیل کے ہیں۔
جو شخص طلبِ علم کے نکلتا ہے، فرشتے اس پر (اس کے پاؤں کے نیچے) اپنے پر بچھاتے ہیں۔
عالم کی طرف ایک نگاہ ڈالنا ساٹھ سال کے قیام اور صیام سے بہتر ہے۔
طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم۔
العلم علمان۔ علم الادیان وعلم الابدان وغیرہ۔

فضائل صحابہ	اکثر حدیثیں موضوع ہیں۔
مناقب اہلِ بیت	" " "
ہدیہ اور تحفہ کی فضیلت	" " "
نکاح کی فضیلت اور عورتوں کی مدح	" " "
فضائل درود	" " "
مدائح نبی صلے اللہ علیہ وسلم	" " " مثلاً

لولاک لما خلقت الافلاک۔
کنت نبیًا وادم بین الماء والطین۔
انا مدینة العلم وعلی بابھا۔
انا افصح العرب والعجم۔

امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ تین کتابیں ہیں، جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ مغازی۔ ملاحم اور تفسیر۔ ہر چند کہ علماء نے اس کی تاویل کی ہے، لیکن فی نفسہٖ یہ قول کسی تاویل کا محتاج نہیں۔ چند حدیثیں ان ابواب میں اگر صحیح ثابت ہوگئیں تو مستثنیات میں ہیں۔

افتراقِ اُمت کے متعلق جتنی حدیثیں ہیں موضوع ہیں۔ مثلاً یہود و نصاریٰ کے ۷۲ فرقے ہوئے اور میری اُمت کے ۷۳ ہوں گے، جن میں سے صرف ایک جنتی ہے۔ اس کی غلطی واقعتاً بھی ظاہر ہے، کیونکہ ۷۲ فرقے مسلمانوں کے چوتھی اور پانچویں ہی صدی ہجری میں علماء نے شمار کر دیئے تھے۔ اس کے بعد سے آج تک سینکڑوں فرقے بنے اور بنتے جارہے ہیں۔

موضوعِ صحابہ

اگرچہ ائمہ محدثین اور جملہ اہلِ تاریخ اس بات پر متفق ہیں کہ روئے زمین میں سب سے آخری صحابی جو رہ گئے تھے، وہ حضرت ابو الطفیل عامر بن واثلہ ہیں، جنہوں نے مکہ میں ۱۰۲ھ میں وفات پائی۔ مگر ان کذابوں اور وضاعوں نے زمانہ بعد میں بہت سے طویل العمر صحابہؓ مخترع کر لیے۔ من جملہ ان کے یہ لوگ ہیں:-

جبیر بن حرب: حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ غزوۂ خندق میں شریک تھے۔ امیر عبدالکریم بن نصر کا بیان ہے کہ میں نے امام ناصر کے ساتھ ۵۷۰ھ میں ان کی زیارت کی تھی۔

ابو عبداللہ محمد نقلی: پانچویں صدی ہجری میں تھے۔ ان کے بارے میں بیان کیا گیا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا تھا۔ لوگ جا کر تبرکاً ان سے مصافحہ کرتے تھے۔

قیس بن تمیم: ان کی پیشانی پر ایک نشان تھا جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ حضرت علی رضؓ کے خچر نے لات ماری تھی۔ چھٹی صدی ہجری کے آغاز یعنی ۵۱۷ھ میں ان سے حدیثیں روایت کی جاتی تھیں۔ گیلان میں رہتے تھے۔

بابا رتن ہندی: متوفی ۶۳۲ھ۔ ان کی نسبت کہا جاتا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کی تقریب میں شریک تھے۔ ہندوستان میں رہتے تھے۔

ان زندہ صحابیوں کو کھڑا کر کے ان کی زبان سے طرح طرح کی روایتیں اُمّت میں پھیلائی جاتی تھیں۔ بعض لوگ سندعالی کے خیال سے ان ثلاثیات کو کتابوں میں درج کرتے تھے۔ علماء کی ذہنیت اس قدر جامد تھی کہ جب ائمہ حدیث ان خرافات کا انکار کرنے لگے تو بعض لوگوں نے ان کے ساتھ مجادلہ کیا۔ امام ذہبی نے بابا رتن کی جملہ روایتیں موضوعات میں شامل کیں۔ اس پر علامہ مجدالدین صاحب قاموس بگڑ بیٹھے۔ اسی طرح حافظ ابنِ حجر نے جب ان خرافات کی تغلیط کی تو علامہ صفدی ان کی تردید کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مقامِ حدیث

علامہ اسلم جیراجپوری کے اس مقالہ میں علمِ حدیث کا صرف ایک گوشہ سامنے آیا ہے۔ اس کے بہت سے اور گوشے بھی ہیں جن کے سامنے آنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ احادیث کے مجموعے کب مرتّب ہوئے۔ کن حضرات نے انہیں مرتّب کیا۔ دین کے نقطۂ نگاہ سے ان کی پوزیشن کیا ہے۔ انہیں کس حد تک یقینی طور پر اقوال و اعمالِ رسول اللہؐ کہا جا سکتا ہے مختلف فرقوں کے مجموعوں کے اختلافات کس قدر ہیں۔ اسلامی مملکت کے لئے قوانین سازی کے سلسلہ میں ان کی پوزیشن کیا ہوگی۔ یہ، اور اس قسم کے دیگر متعدد سوالات کے جواب کے لئے ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب مقامِ حدیث کا مطالعہ بڑا مفید رہے گا۔

قیمت فی جلد دس روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور

نوشتہ: اکتوبر ۱۹۵۱ء
(وضاحت آخر میں ملے گی)

ثواب ہوتا کیا ہے؟

پرویز

انسان اپنا مفہوم الفاظ کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ اسی لئے اسے حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ رفتہ رفتہ الفاظ باقی رہ جاتے ہیں اور جس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے وہ وضع ہوئے تھے، وہ مفہوم گم ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ چیز کچھ عجیب سی نظر آئے گی کہ الفاظ باقی ہوں اور ان کا مفہوم گم ہو چکا ہو لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو بادنیٰ تعمق ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ متعدد الفاظ ہیں جنہیں ہم صبح سے شام تک بلاتکلف استعمال کئے جاتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ بالآخر ان کا مفہوم کیا ہے؟ مذہبی دوائرِ حیات میں اس قسم کے الفاظ کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ "مذہب" کو زندگی کے عملی مسائل سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق سطحی جذبات سے ہوتا ہے اور جذبات میں اس کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ یہ سوچا جائے کہ جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "مذہب" چونکہ انسان کے دورِ سحر (MAGIC AGE) کی یادگار ہے اس لئے اس میں سارا زور الفاظ پر دیا جاتا ہے۔ ان کے مفہوم سے کچھ مطلب نہیں ہوتا۔ سحر کی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ الفاظ (بلا مفہوم) کو الٹ پھیر اور اعادہ سے کام لیا جائے۔ تعویذوں کے الفاظ کو دیکھئے۔ عجیب مہملات کا مجموعہ دکھائی دیں گے۔ لیکن تعویذ لکھنے والے ان کی پابندی پر ...... اس قدر زور دیں گے کہ اگر ایک حرف میں بھی رد و بدل ہو جائے تو وہ سمجھ لیں گے کہ اب اثر نہیں ہو سکتا۔ "الفاظ بلا مفہوم" یہ ہے "مذہب" کی صحیح تعریف۔

اسلام "مذہب" کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھا۔ وہ مذہب کے بجائے دین لے کر آیا تھا جسے آجکل کی اصطلاح میں آئینی نظامِ زندگی کہا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک نظامِ زندگی، نظری مسائل سے نہیں بلکہ زندگی کے عملی مسائل سے بحث کرے گا اور جب اس کی بحث کا دائرہ عملی مسائلِ حیات پر مشتمل ہو تو اس کے الفاظ واضح اور متعین مفہوم کے پیکر ہوں گے۔ اس میں "لفظ بلا معنیٰ" کا تصور بھی نہیں کیا جا سکے گا۔ قانون اور آئین کی دنیا میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا جس کا مفہوم ٹھیک ٹھیک متعین نہ کر دیا گیا ہو۔ اگر کسی لفظ کی تعریف (DEFINITION) میں ذرا سا فرق ہو جائے تو اس سے پورے کا پورا قانون بدل جاتا ہے۔ اسی لئے قانون کی کتابوں میں ہر لفظ کی تعریف، متعین کر دی جاتی ہے۔ مثلاً چوری جرم ہے۔ لیکن قانون کی کتاب میں پہلے

یہ بتایا جائے گا کہ چوری کہتے کسے ہیں۔ اس لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ اسی متعیّنہ مفہوم کے مطابق یہ فیصلہ ہوگا کہ فلاں عمل، چوری کہلا سکتا ہے یا نہیں۔

اسلام جب ایک آئینی اور قانونی نظامِ زندگی اپنے ساتھ لایا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے ہر لفظ اور ہر اصطلاح کا مفہوم متعیّن ہوگا۔ بلا تعیّنِ مفہوم، نہ قانون، قانون رہ سکتا ہے نہ آئین، آئین۔ اسلام کا ضابطۂ آئین "قرآن ہے" اور قرآن کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ کا مفہوم خود متعیّن کر دیتا ہے۔ اسی لئے وہ کتابِ مبین ہے۔ "مذہبی منتروں" کی کتاب نہیں ہے۔ لیکن جب قرآن کا دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو جس طرح ہر مذہب کی حالت ہے، اس کے الفاظ تو باقی رہ گئے۔ ان الفاظ کا مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم صبح سے شام تک ان الفاظ کو دہراتے رہتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ انہی الفاظ میں ایک لفظ "ثواب" بھی ہے۔ مذہب پرست طبقہ میں دیکھئے۔ بات بات میں اس لفظ کو دہرایا جائے گا۔ یہ کرنے سے اتنا ثواب ہوتا ہے، وہ کرنے سے اتنا ثواب ملتا ہے۔ جس بات کے متعلق پوچھئے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا تو اس کا جواب یہی ملے گا کہ اس سے ثواب ہوگا۔ لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ صاحب! ثواب ہوتا کیا ہے؟ تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ اس کا کوئی معقول جواب آپ کو نہ ملے گا۔ آپ کو یہ بات بظاہر تعجب انگیز سی دکھائی دے گی۔ (اور ہر وہ بات جس پر پہلے پہل غور کرنے کی دعوت دی جائے تعجب انگیز نظر آیا کرتی ہے) لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ امرِ واقعہ ہے، آپ دُور نہ جایئے، خود اپنے آپ سے سوال کر کے دیکھئے۔ آپ نے بھی تو اس لفظ کو متعدد بار بولا ہوگا۔ ذرا سوچیئے تو سہی کہ آپ کے ذہن میں اس کا مفہوم کیا ہے؟ آپ کو اپنے ذہن سے زیادہ سے زیادہ یہ جواب ملے گا کہ "ثواب" کوئی ایسی چیز ہے جس سے قیامت میں جہنم کے عذاب سے نجات ملے گی۔ یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا تعلق آپ کی اس زندگی سے ہو۔ اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے اور وہاں کے متعلق کہا نہیں جا سکتا کہ وہاں کیا ہوگا اور کیسے ہوگا۔ یہ ہے "ثواب" کا وہ مفہوم جو آپ کے ذہن میں آئے گا یا آپ کو وہ شخص بتائے گا جس سے آپ اس کا مفہوم پوچھیں گے۔

غور کیجئے کہ یہ لفظ ایسا ہے جس کا استعمال بات بات میں ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم ایسا مبہم بتایا جاتا ہے جس سے کچھ پتے ہی نہیں پڑتا کہ بات کیا ہوئی! آپ سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ مذہب پرست طبقہ ہمیشہ شکایت کرتا رہتا ہے کہ مسلمان اسلامی احکام کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کی زندگی مذہبی نہیں رہی۔ وہ اوامر و نواہی کے پابند نہیں۔ یہ لوگ شکایت تو مسلسل کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ بالآخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ آپ ایک بچے سے تو اس طرح کام کرا سکتے ہیں کہ یہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ بغیر بتائے ہوئے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا۔ لیکن جب وہی بچہ صاحبِ فکر و شعور ہو جائے تو اس وقت آپ اس سے اس طرح احکام نہیں منوا سکتے۔ اس وقت، آپ کو بتانا ہوگا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا؟ "مذہب" کی تاکید یہ ہوتی ہے کہ ان معاملات میں عقل کو کوئی دخل نہیں، اس لئے تم "کیوں" نہ پوچھو، جو کچھ کہا جاتا ہے چپکے سے کئے جاؤ۔ انسانی ذہن اپنے عہدِ طفولیت میں تو اس طریقِ کار پر عمل پیرا ہو سکتا تھا لیکن جب وہ "کیوں" کے مقام تک پہنچ جائے تو پھر مجرّد حکم اس کے لئے محرکِ عمل نہیں ہو سکتا۔ وہ حکم کی لِم بھی سمجھنا چاہتا ہے۔ چونکہ قرآن، مذہب

نہیں بلکہ وہ دین لایا تھا اس لئے اس نے ذہنِ انسانی کے اس تقاضے کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ کتاب (قانون یا حکم) کے ساتھ حکمت (اس کی علّت "کیوں") بھی بتا دی اور ہر مقام پر واضح کر دیا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا؟ اس نے اپنی دعوت کی بنیاد ہی علم و بصیرت پر رکھی۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ صاحبانِ عقل و بصیرت خود دیکھ سکتے ہیں کہ اس نظامِ حیات کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس نے کھلے کھلے طور پر کہہ دیا کہ بدترین خلائق (شرالدواب) وہ انسان ہیں جو عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ دنیا کا کوئی نظام ہو اس کی جاذبیت کا راز اس کے نتائج میں مضمر ہوتا ہے۔ اور نتائج اس ٹھوس حقیقت کا نام ہے جو بلا حجاب و نقاب سامنے آجائے۔ مبہم الفاظ، غیر متعین مفہوم، کبھی نتائج کی جگہ نہیں لے سکتے۔ یہ ہے اصل وجہ اس امر کی کہ مسلمان "مذہبی احکام" کی پابندی نہیں کرتے۔ مبہم الفاظ، کبھی سوچنے والے ذہن کے لئے وجہِ کشش نہیں ہو سکتے۔ ان سے صرف وہی طبقہ وابستہ رہ سکتا ہے جس کا ذہن ہنوز "عہدِ طفولیت" میں ہو۔ سوچنے والا ذہن، کتاب (حکم) کے ساتھ اس کی حکمت (علّت) کا بھی تقاضا کرتا ہے اور حکم کی علّت اس کے نتیجہ ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ دین (نظامِ زندگی) نتائج پیش کرتا ہے اور یہی نتائج اس کی کشش کا باعث ہوتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد، لفظ ثواب پر غور کیجئے۔ ثاب کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کا لوٹ کر آجانا۔ کسی حوض کا اس طرح لبالب بھرے رہنا کہ جتنا پانی اس میں سے نکلے اتنا ہی اس میں واپس آتا رہے۔ استثاب کے معنی (RESTORATION) کے ہیں۔ یا کاروباری زبان میں یوں سمجھئے کہ آپ جو کچھ (INVEST) کرتے ہیں، اس کی (RETURN) کو ثواب کہتے ہیں۔

آپ کوئی کام کیجئے۔ اس میں کچھ نہ کچھ صرف ہوگا۔ مال۔ وقت۔ توانائی (ENERGY) ذہنی ہو یا جسمانی۔ اگر اس کام کا نتیجہ اس صرف شدہ توانائی کو واپس لے آتا ہے تو وہ نتیجہ اس کا ثواب ہوگا۔ ثاب جسمہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جسم سے جس قدر توانائی زائل ہو جائے وہ پھر واپس آجائے اور اس طرح جسم تنومند و توانا رہے۔ مثلاً آپ سیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپ کی کچھ توانائی (ENERGY) صرف ہوتی ہے۔ لیکن وہ سیر آپ کی صحت کے لئے مفید ہے۔ اس لئے وہ صرف شدہ توانائی کو واپس لاتا ہے اور آپ کی صحت کو بھی درست کرتا ہے جس سے آپ کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ سیر کا ثواب ہے۔ اسلام کے نظام (الدّین) میں ہر فرد اپنے مفوضہ فرائض کو سرانجام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ان افراد کا وقت۔ مال۔ توانائی۔ ذہنی اور قلبی قوتیں صرف ہوتی ہیں۔ اس نظام کے اجتماعی نتائج ان صرف شدہ قوتوں کو بھی واپس دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ارتقائے انسانیت کا وہ مقصد بھی پورا ہوتا (اور آگے بڑھتا) رہتا ہے جس سے انسان، کارگہِ عالم کے تخلیقی پروگرام میں، خدا کا رفیق بنتا ہے۔ اس قرآنی نظامِ زندگی کے نتائج کو "ثواب اللہ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ

ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا (۲۸/۸۰)

جس نے اس نظام کی حقانیت کو تسلیم کر لیا اور اس کے بعد صلاحیت بخش کام کئے ان کے لئے اس نظام کے نتائج بڑے خوشگوار ہوں گے۔

لہٰذا، ثواب اللہ کے معنی ہیں اس نظامِ زندگی کے جیتے جاگتے نتائج جو قرآنی اصولوں کے مطابق قائم کیا جائے۔ لیکن قرآن نے اس لفظ (ثواب) کے انتخاب (اور استعمال) سے ایک اور اہم حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ "مذہب" کی عمارت "ثنویت" (DUALISM) پر قائم ہوتی ہے۔ یعنی اس میں دنیا اور آخرت، روح اور مادہ، ملک و دین کو دو الگ الگ شعبے قرار دیا جاتا ہے جن میں نہ صرف یہ کہ باہمی کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے کے نقیض اور مخالف ہوتے ہیں اور یہ دونوں ایک جگہ سما نہیں سکتے۔ لیکن قرآن نے اس ثنویت (دین اور دنیا کی علیحدگی) کو تصورِ باطل قرار دیا اور اعلان کر دیا کہ نظامِ زندگی ان دونوں کے تانے اور بانے سے مل کر بنتا ہے۔ نہ اکیلا "تانا" کسی مطلب کا ہوتا ہے نہ بانا۔ دیکھئے، قرآن نے اس حقیقت کو کس حسن و خوبی سے، دو لفظوں میں نکھار کر رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا کہ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًى (۷۵/۳۶) اس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے "کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے بیکار چھوڑ دیا گیا ہے؟" لیکن اس کے صحیح مفہوم کا راز لفظ سُدًی میں ہے۔ سُدی کے معنی ہیں کپڑے کا "تانا"۔ یعنی صرف "تانا" ہی تانا۔ اس کے ساتھ "بانا" نہیں۔ لہٰذا اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ انسان کا یہ تصور کہ زندگی صرف تانے ہی تانے کا نام ہے، تصورِ باطل ہے۔ "تانا" اور "بانا" الگ الگ رکھئے، اس سے کپڑا نہیں بن سکتا۔ جب ان دونوں کو ایک دوسرے میں بُن دیا جائے تو وہ کپڑا بن جاتا ہے۔ کپڑے کو ثوب کہتے ہیں۔ یعنی مستقل اور درخشندہ نتائج صرف اسی نظام سے مرتب ہو سکتے ہیں جس میں روح اور مادہ، دنیا اور آخرت اور ملک و دین کو باہمدگر سمو دیا جائے اور اس طرح حالتِ سُدی کو کیفیتِ ثوبی سے بدل دیا جائے۔ اسی تبدیلی کو ثواب کہا جائے گا۔

دنیا کے عام نظامہائے معاشرت (جن کی اساس مستقل اقدار پر نہیں ہوتی) طبعی قوانین کے مطابق اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ جو شخص اچھی خوراک کھائے گا تندرست و توانا رہے گا۔ لیکن ان نتائج کا تعلق انسان کے ہیتی یا افتادہ مفاد تک ہی محدود ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی جوئے رواں کے ساتھ ساتھ نہیں چلتے۔ انہیں قرآن ثوابُ الدُّنیا کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ذرا سوچو! یہ تمہاری کیسی بھول ہے کہ تم اتنی تگ و تاز بھی کرتے ہو لیکن اس کے بعد صرف قریبی مفاد پر اکتفا کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ اگر تم اپنے معاشرے کو مستقل اقدار (وحی) کے خطوط پر متشکل کر لو تو اسی تگ و تاز سے یہ قریبی مفاد بھی حاصل ہو جائے اور ان کا سلسلہ آگے بھی بڑھتا جائے۔ ان نتائج کا نام ثَوَابُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا "جو لوگ صرف قریبی مفاد تک ہی رک کر رہ جاتے ہیں" ان سے کہو کہ فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۴/۱۳۴) "نظامِ خداوندی میں قریب اور بعید دونوں کے مفاد حاصل ہوتے ہیں۔ سو بتاؤ کہ یہ نظام اچھا ہے یا تمہارا نظام۔" ظاہر ہے کہ نظام وہی اچھا ہو گا جس کے نتائج کا سلسلہ حیاتِ انسانی کے ساتھ آخرت تک مسلسل قائم رہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ اپنے سامنے ہمیشہ یہ آرزو رکھو کہ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۲۰۱) دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں اور کامیابیاں۔ قرآن کی رو سے نظامِ زندگی کے تین انداز ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ نظام جس کے خوشگوار نتائج

انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ رواں دواں چلتے رہیں - اور اس طرح یہاں سے آخرت تک شاہراہِ حیات شگفتہ و شاداب رہے - یہ ہے الدین کا وہ نظام جس میں ثَوَابَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، دونوں حاصل ہوتے ہیں۔

دوسرا نظام وہ ہے جسے دنیا کی قومیں اپنی مصلحت کوشیوں کے ماتحت وضع کرتی ہیں اور اپنی نگاہوں کو صرف اسی زندگی تک محدود رکھتی ہیں۔ اس نظامِ زندگی کے نتائج اسی دنیا تک محدود رہتے ہیں...... وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ - اس کے بعد کی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یہ خالص دنیاداری کی زندگی ہے - یعنی سیکولرازم۔

تیسرا نظام وہ ہے جس میں نہ اس زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں نہ اس کے بعد کی زندگی کی - یہ ہے "مذہب کی زندگی"۔ اس زندگی میں انسان اپنے آپ کو اس دھوکے میں رکھتا ہے کہ اگر ہماری موجودہ زندگی ذلت و خواری کی زندگی ہے تو کوئی بات نہیں - یہ زندگی چند روزہ ہے۔ اس کے بعد حیاتِ ابدی کی ہمیشہ رہنے والی خوشگواریوں کے ہم ہی مالک ہیں - لیکن قرآن کی رو سے یہ بہت بڑا دھوکا ہے۔ نفس کا فریب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا "کیا تمہیں بتاؤں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے کاموں کا نتیجہ خسارہ ہی خسارہ ہے"۔ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ "یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیاوی زندگی ہی میں غلط راہوں پر پڑ جاتی ہیں"۔ وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ "لیکن وہ بزعمِ خویش سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک کام کر رہے ہیں"۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو درحقیقت قانونِ خداوندی کا عملی انکار کرتے ہیں"۔ اس طرح کہ حقائق کا آمنا سامنا کرنے (TO FACE REALITIES) کی بجائے وہ ان سے گریز کی راہیں نکالتے ہیں"۔ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ۔ ان کے کام بظاہر بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔ (۱۸/۱۰۲-۱۰۴) "یہ اعمال ایسے بے نتیجہ ہوتے ہیں کہ قیامِ انسانیت کے سلسلہ میں ان کا وزن تک معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بالکل بے وزن ہوتے ہیں"۔ "مذہب پرست" طبقہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتا ہے کہ اگر ہماری آج کی دنیا خوشگوار نہیں تو نہ سہی - آخرت کی نعمتیں تو ہمارے ہی لئے ہیں۔ لیکن یہی ان کی بھول ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى - (۱۷/۷۲) "اس دنیا کا اندھا اُس دنیا میں بھی اندھا ہی رہے گا"۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ آج کی دنیا ذلیل اور خوار ہو اور کل کی دنیا میں ساری سرفرازیاں انہیں کے حصہ میں آجائیں - لہٰذا:-

(۱) اسلام کے نظامِ حیات میں امروز اور فردا دونوں خوشگوار ہوتے ہیں۔

(۲) عام دنیاوی نظام میں، صرف امروز خوشگوار ہوتا ہے -

(۳) اور مذہب کی دنیا میں نہ آج خوشگوار ہوتا ہے نہ کل - ایک مقدس دھوکا ہوتا ہے اور بس۔ وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ ہم صدیوں سے اس مقدس دھوکے میں مبتلا ہیں۔

(٥)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے ثواب کے معنی ہیں:-

اعمالِ حیات کے وہ زندہ اور مثبت نتائج جو محسوس شکل میں ہمارے سامنے آجائیں اور جس سے ہماری دنیاوی زندگی بھی خوشگوار ہو اور بعد کی زندگی بھی۔
جو اعمالِ حیات، اپنے محسوس نتائج پیدا نہیں کرتے، یاد رکھئے کہ ان کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔
اب آپ اپنے لئے خود میزان قائم کرکے دیکھ لیجئے کہ آپ کے کون کون سے اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب ہوتا ہے، اور کون کون سے ایسے جن کا کوئی ثواب نہیں ہوتا۔

اے مسلمان! اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ

(۰)

وضاحت

میرا یہ مقالہ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی اہمیت اس کے متن سے واضح ہے۔ لیکن اس کی اس وقت (بارِ دیگر) اشاعت کی ایک خاص وجہ ہے۔ پچھلے دنوں طلوعِ اسلام میں جو مقالات شائع ہوئے، جن میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، صیام (روزوں) اور حج کا مقصد کیا ہے، تو اس سلسلہ میں مجھے بہت سے استفسارات موصول ہوئے، جن کا ملخص یہ ہے:۔

آپ نے روزوں کا مقصد تو بتایا ہے کہ اس سے اُمّت اس قابل ہو جاتی ہے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی (قرآن کی حکومت) قائم کرے، اور حج سے مقصد یہ ہے کہ اقوامِ عالم آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ اُمّت ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہی ہے۔ لیکن ہمارے مروجہ روزوں اور حج (بلکہ نماز اور زکوٰۃ تک) سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے جو قرآن مجید نے بتائے ہیں۔ اس سے ذہن لامحالہ اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ ہمارے یہ اعمال "حبطت اعمالھم" کے زمرہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ یعنی رائگاں جاتے ہیں۔ لیکن مولوی صاحبان بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں۔ ان کا ثواب ملتا ہے اور یہ بہت بڑا اجر ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ جن اعمال اور شعائر کے وہ نتائج مرتب نہیں ہوتے جو قرآن مجید نے بتائے ہیں، وہ رائگاں نہیں جاتے۔ ان کا ثواب ملتا ہے؟ پھر یہ بھی بتائیے کہ "ثواب" ہوتا کیا ہے؟

اس قسم کے ہیں وہ استفسارات جو مجھے موصول ہوئے اور جن کی بنا پر میں نے اپنے ۱۹۵۱ء کے مقالہ کی دوبارہ اشاعت اور اس کے ساتھ یہ مزید وضاحت ضروری سمجھی۔

قرآنِ کریم ایک نظامِ زندگی (الدّین) عطا کرتا، اور اسے قائم کرنا اُمّتِ مسلمہ کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ یہ نظام اسی دنیا میں قائم ہوتا ہے اس لئے (ہر نظامِ زندگی کی طرح) اس کے محسوس نتائج اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے کہ یہ پرکھا جا سکے کہ یہ نظام صحیح شکل میں قائم ہوا ہے یا نہیں، قرآن مجید میں اس کے نتائج کو بھی خود ہی واضح کر دیا گیا ہے۔ صوم و صلوٰۃ یا زکوٰۃ و حج وغیرہ اس نظام کے پروگرام کے مختلف گوشے ہیں، اور جنہیں ہم ان کے مقاصد کہتے ہیں، وہ درحقیقت ان کے محسوس نتائج ہیں جو اس نظام کے قیام سے سامنے آتے

ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان نتائج یا مقاصد کا ماحصل، مختصر ترین، اور اس کے ساتھ ہی حسین ترین الفاظ میں متعین کر دیا ہے، ..... فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ..... (۲/۲۰۱)۔ یعنی ان سے انسان (کی انفرادی اور اجتماعی) زندگی سنور جاتی ہے۔ حسین ہو جاتی ہے۔ اس اجمال میں زندگی کی ہر طرح کی خوشگواریاں، شادابیاں، سرفرازیاں، کامرانیاں ــــ حکومت، دولت، سطوت اور اس کے ساتھ ہی امن و سکون اور خوف و حزن سے مامونیت شامل ہیں۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے ان ارکان کی ادائیگی کا۔

لیکن چونکہ (قرآن کی رو سے) زندگی، اسی دنیا کی زندگی نہیں۔ اس لئے اس نظام کے قیام سے مرنے کے بعد کی زندگی (حیاتِ آخرت) بھی سنور جاتی ہے۔ وہاں کی فوز و فلاح بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً کے ساتھ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً ..... (۲/۲۰۱) کا اضافہ بھی کر دیا۔

یہ ظاہر ہے کہ آخرت کی حسنات کا ہم، اس دنیا میں رہتے ہوئے، مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم ــــ "اُخروی حسنات" کی رو سے اس امر کا جائزہ نہیں لے سکتے کہ یہ ارکان اپنا نتیجہ پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔ اس کا جائزہ انہی نتائج سے لیا جا سکے گا، جو اس دنیا میں محسوس طور پر سامنے آ جائیں۔ اگر ان ارکان کی ادائیگی سے اس دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ہم اَعْلَوْنَ کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ یعنی تمام اقوامِ عالم پر غالب آ جاتے ہیں، تو سمجھا جائے گا کہ یہ ارکان صحیح طور پر ادا ہو رہے ہیں۔ نیز یہ کہ ہماری عاقبت بھی سنور رہی ہے۔ اور اگر ہمیں یہاں یہ امتیازات حاصل نہیں، تو پھر ہماری عاقبت بھی سنور نہیں سکتی۔ یہ ایک ایسا (TEST) ہے جس سے نہ کوئی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، نہ انسان خود فریبی میں مبتلا رہ سکتا ہے۔

یہی وہ (TEST) تھا جسے نبی اکرمؐ نے اس نظام کے مخالفین کے سامنے پیش کیا تھا۔ آپ نے ان سے کہا تھا کہ، یہ دیکھنے کے لئے کہ جو دعوت میں پیش کرتا ہوں وہ مبنی بر صداقت ہے یا وہ دعوت جسے تم پیش کرتے ہو کسی بحث و مباحثے، جھگڑے جھمیلے کی ضرورت نہیں۔ اس کا طریق بڑا صاف اور سیدھا ہے۔ اور وہ یہ کہ

(قُلْ) يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (۶/۱۳۶)

اے میری قوم کے لوگو! تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو، مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ نتائج خود بخود، اور بہت جلد بتا دیں گے کہ آخر الامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے اور ظالمین کس طرح ناکام رہ جاتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے ..... سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ..... (۱۱/۹۳)

"تم بہت جلد دیکھ لو گے کہ کون تباہ و برباد اور ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ اور اس طرح یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے گی کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا"۔

آپ غور کیجئے! حضورؐ نے ان سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم اپنے طور پر پوجا پاٹ کرتے رہو، ہمیں اپنے طریق سے نماز، روزہ ادا کر لینے دو۔ اس کے بعد قیامت میں جا کر دیکھ لینا کہ کون سچا تھا اور کون جھوٹا۔ حضورؐ نے ان

سے کہا تھا کہ تم بہت جلد دیکھ لو گے کہ کون ذلیل و خوار ہوتا ہے، اور کون کامیاب و کامران۔

اور اس (TEST) کے نتائج کو اسی قوم نے نہیں۔ ساری دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

اعمالِ انسانی کے نتائج کو قرآن کریم کی اصطلاح میں ثواب کہا گیا ہے، خواہ وہ غلط نظام کے نتائج ہوں اور خواہ صحیح (قرآنی) نظام کے۔ غلط نظام کے نتائج کے متعلق کہا: هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۸۳/۳۶)۔ یہ مخالفین جس قسم کے کام کرتے ہیں، انہی کے نتائج ان کے سامنے آئیں گے۔

جہاں تک قرآنی نظام کا تعلق ہے اس کے "ثواب" کو ایسے واضح، محسوس اور غیر مبہم الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جس میں کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان نہ ہو۔ صلح حدیبیہ کے وقت ایسا نازک مقام آ گیا تھا جہاں ان مجاہدین نے "اپنی جان و مال کے بیچ دینے" کے معاہدہ کی تجدید کی تھی۔ اس کے "ثواب" کے سلسلہ میں فرمایا۔

..... وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ..... (۴۸/۱۸-۱۹)

خدا نے ان کے لئے مستقبل قریب میں فتوحات کی راہیں کھول دیں۔ اور بہت سا مالِ غنیمت بھی ان کے ہاتھ آیا۔

آپ نے غور فرمایا کہ انہیں ان کے حسنِ عمل کا "ثواب" کس شکل میں ملا؟ یہ ثواب الدنیا تھا۔ اور ثواب الآخرۃ، اس پر مستزاد، بلکہ اسی کا لاحقہ تھا۔ یہ انہی کی خصوصیت نہیں تھی۔ انبیاء سابقہ کی جماعتوں کو بھی اس قسم کا ثواب ملتا رہا تھا۔ سورۂ آلِ عمران میں، جماعتِ مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

یہ بات کہ تمہیں اپنے مخالفین کا مقابلہ کرنا ہوگا، کوئی نئی بات نہیں۔ تم سے پہلے کتنے ہی نبی گذرے ہیں جن کی معیت میں نظامِ ربوبیت کے علمبرداروں نے مخالفین سے جنگ کی۔ اس راہ میں انہیں جو تکالیف پیش آئیں ان سے نہ تو ان کے عزائم میں لغزش آئی، نہ ان میں کمزوری پیدا ہوئی۔ نہ ہی وہ مسلسل محنت سے تھک کر ہمت ہار گئے اور انہوں نے ہتھیار رکھ دیئے۔ وہ ان تمام مراحل میں ثابت قدم رہے اور خدا کا قانونِ مکافات ان کا ساتھ دیتا رہا۔

یہ لوگ اپنے آہنی عزم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ ان کی زبان پر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اگر ہم سے کوئی لغزش یا کوتاہی ہو جائے، یا کسی معاملہ میں ہم حد سے آگے بڑھ جائیں تو ہماری ان غلطیوں کے مضر اثرات سے ہمیں محفوظ رکھنا۔ ہمیں ثابت قدم رہنے کی توفیق دینا اور مخالفین پر غلبہ اور کامیابی عطا کرنا۔ (۳/۱۴۶-۱۴۷)

"اعمال" کا اندازہ آپ نے لگا لیا۔ اب ان کا "ثواب" ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوا:۔

فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۳/۱۴۸)

ان کے اعمال کے بدلے میں خدا نے انہیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں (ثواب الدنیا) بھی عطا کیں اور آخروی زندگی کی نعمتیں (ثواب الآخرۃ) بھی۔ یہ ہیں حسنِ اعمال کے وہ پیکر جو خدا کے نزدیک پسندیدہ قرار پاتے ہیں۔ (نیز ۴/۱۳۴)۔

آپ نے غور فرمایا کہ "ثواب" کا مفہوم کیا ہے؟ یہ تھا صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج وغیرہ شعائر و ارکان کا وہ ثواب، جو

الدین کے زمانے میں حاصل ہوتا تھا۔ وہ بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی ایسی مملکت جس میں کوئی فرد نہ کسی کا محتاج تھا نہ محکوم، اور جس کی طرف دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کیونکہ ان کے خدا کا ارشاد تھا کہ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۔۔۔ (۴/۱۴۱) "یہ ہو نہیں سکتا کہ غیر مسلم، مومنین پر غلبہ حاصل کرنے کی راہ پالیں"۔

(۰)

اس کے بعد، اس اُمت پر ملوکیت چھا گئی اور دین، مذہب میں بدل گیا۔ مذہب کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ دین کے ارکان و شعائر کی شکل و صورت تو بدستور قائم رکھتا ہے لیکن ان کے مقصد و غایت (نتائج) کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ یہ ٹیکنیک کامیاب رہی، لیکن اس کے بعد لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ ہم ان ارکان کی ادائیگی کیوں کریں؟ اس سے ہمیں حاصل کیا ہوگا؟ اس سے ہمیں کیا ملے گا؟ یہ سوال بڑا مشکل تھا لیکن انہوں نے اس کا بہت آسان حل تلاش کر لیا۔ انہوں نے کہا کہ اس سے تمہیں "ثواب" ملے گا۔ اور جب پوچھا گیا کہ ثواب سے حاصل کیا ہوگا تو کہہ دیا کہ آخرت کی نجات۔ یعنی "ثواب الدنیا" کو غائب کر کے، انہیں ثواب الآخرۃ کی اصطلاح سے مطمئن کر دیا۔ جس کے لئے نہ کسی دلیل کی ضرورت تھی، نہ ثبوت کی حاجت! "ثواب الدنیا" سے اسی دنیا میں محسوس و مرئی نتائج سامنے آتے تھے۔ "ثواب الآخرۃ" سے صرف جذبات کی تسکین ہو گئی۔ ہر شخص صبر آزما محنت مشقت کے بعد مطمئن ہو گیا کہ اس نے اس قدر ثواب کما لیا ہے۔

یہیں سے حبطِ اعمال کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ ۱۹۵۱ء کے مقالہ میں سورۂ کہف کی جو آیات درج کی گئی ہیں ان میں ایک نکتہ سارا مطلب واضح کر دیتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں، وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۔۔۔۔ (۱۸/۱۰۴) "جو نہایت نیک نیتی سے سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے اچھے نیک کام کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی جرائم پیشہ لوگ تو ہو نہیں سکتے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ وہ نیک کام کر رہا ہے۔" لامحالہ وہ لوگ ہیں جو غیر اسلامی نظام میں رہتے ہوئے مذہبی رسوم و ارکان کو پابندی سے ادا کرتے ہیں اور اس کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ وہ بڑے نیک کام کرتے ہیں۔ ان اعمال کے رائیگاں جانے کا مطلب یہ ہے کہ جن مقاصد کے حصول کے لئے انہیں متعین کیا گیا تھا، ان سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔ ان کی ادائیگی سے، فردِ متعلقہ کو جھوٹا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے، اور بس۔ یہ کیفیت ہر رسم کی ہوتی ہے۔ ہم معاشرتی رسوم کو، ان کی جزئیات تک کی پابندی کے ساتھ نہایت احتیاط سے ادا کرتے ہیں۔ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں، اس کا جواب کوئی نہیں دے سکے گا، لیکن اس سے ہمیں اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ ہم نے ایک ضروری کام کر لیا۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو دل پر ایک بوجھ سا رہتا ہے اور انسان اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ لڑکی کو گھر سے وداع کرتے وقت اس کے پیچھے چاول کیوں چھڑکے جاتے ہیں؟ اس کا جواب کوئی نہیں دے سکے گا، لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو مدت تک دل دھڑکتا رہے گا کہ (خدانکردہ) کوئی آفت نہ آجائے۔ جب یہ رسوم وضع ہوئی تھیں تو ان کی کوئی نہ کوئی غرض و غایت ضرور رہی ہوگی۔ لیکن مرورِ زمانہ سے وہ غرض و غایت تو نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور صرف رسوم باقی رہ گئیں۔ دین کے پروگرام کے اجزا جب مذہبی رسوم بن جائیں،

تو اُن کی کیفیت بھی ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ (مثلاً) ہم میں سے کوئی نہیں بتا سکتا کہ ہم مُردے کے لئے دعائے مغفرت میں ایک بار "الحمد" اور تین بار "قل" کیوں پڑھتے ہیں، لیکن ایسا کر دینے سے ہمیں سکون سا حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ "تین بار قل" کی جگہ "دو بار قل" پڑھ دیئے گئے ہوں، تو وہ سکون جاتا رہتا ہے اور دل پر گرانی سی محسوس ہونے لگ جاتی ہے ——— اور قلوں اور تسبیحوں تک ہی کیا موقوف ہے؟ آپ مذہب کے بڑے سے بڑے رُکن (مثلاً حج) کے متعلق کسی سے پوچھئے کہ آپ حج کیوں کرتے ہیں؟ تو اس کے جواب میں وہ اتنا ہی کہہ سکے گا کہ یہ فریضۂ خداوندی ہے جسے میں ادا کرتا ہوں۔ اور اگر آپ اس سے پوچھیں کہ اس سے ہوتا کیا ہے؟ تو وہ نہایت نیک نیتی سے کہے گا کہ وہاں جا کر جو سرور اور سکون حاصل ہوتا ہے، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن (معاف فرمائیے) یہی جواب ہندو، سکھ، عیسائی سب کی طرف سے ملتا ہے۔ وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا کی کیفیت ہر مذہب میں ہوتی ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے طریق پر عمل کر کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے کہ اس نے بہت بڑا نیکی کا کام کر لیا ہے۔

آیت (۱۸/۱۰۴) میں صُنْعًا کا لفظ اور بھی معنی خیز ہے۔ اس کے معنی ہیں مصنوعی۔ یعنی حقیقی نہیں بلکہ بناوٹی۔ ملمع شدہ۔ مصنوعی شے دیکھنے میں اصلی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت وہ اصلی نہیں ہوتی۔ اصلی اور مصنوعی کا فرق اس وقت سامنے آتا ہے جب اس مصنوعی شے کو کسوٹی پر پرکھا جائے۔ دین میں کسوٹی ہوتے ہیں وہ نتائج جو ان اعمال سے مرتب ہو کر سامنے آئیں۔ آپ دیکھئے کہ قرآن کریم نے ایک آیت میں اس حقیقت کو کس قدر نمایاں طور پر بیان کر دیا ہے۔ فرمایا :-

اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ط ......

اے رسُول! جو کچھ تجھ پر قرآن میں وحی کیا جاتا ہے اسے لوگوں کے سامنے پیش کر، اور صلوٰۃ (کا نظام) قائم کر۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط ...... "یہ حقیقت ہے کہ صلوٰۃ، معاشرہ سے ہر قسم کی بے حیائی کی باتوں اور دیگر برائیوں کو روک دیتی ہے۔ ان کا سدِّباب کر دیتی ہے"۔ یہ ہے حقیقی صلوٰۃ، اور اس کا محسوس نتیجہ۔ لیکن یہ نتیجہ اسی صورت میں پیدا ہو گا، وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط ...... "جب معاشرہ میں اقتدارِ اعلیٰ قانونِ خداوندی کو حاصل ہو"۔ اگر ایسا نہ ہو، تو پھر یہ صلوٰۃ، مصنوعی نماز بن کر رہ جاتی ہے۔ فرمایا: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝ (۲۹/۴۵) "خدا خوب جانتا ہے کہ تم اس قسم کی مصنوعی صلوٰۃ (نماز) پڑھ کر اپنے آپ کو کس قدر مغالطہ میں رکھتے ہو کہ ہم نے بڑا نیک کام کر لیا!

اس سے واضح ہے کہ جس صلوٰۃ کا نتیجہ یہ نہیں کہ معاشرہ سے ہر قسم کی بے حیائی اور برائی کا سدِّباب ہو جائے۔ معاشرہ سے برائیاں ختم ہو جائیں، وہ صلوٰۃ مَا تَصْنَعُوْنَ کے زمرے میں آ جاتی ہے۔ یعنی مصنوعی ہوتی ہے، حقیقی نہیں ہوتی۔

اس قسم کی مصنوعی صلوٰۃ کو دوسری جگہ میکانکی نقل و حرکت (MECHANICAL MOVEMENTS) کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ الماعون میں ہے؛ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ (۱۰۷/۴)

"سو تباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جو صلوٰۃ کے حقیقی مقصد و منتہیٰ سے بے خبر رہتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ هُمْ يُرَآؤُنَ اور اس نشست و برخاست کے بعد، جو لوگوں کو نظر آجائے، مطمئن ہو جاتے ہیں کہ فریضۂ صلوٰۃ ادا ہو گیا...... وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ؁ (۱۰۷/۷-۶) اور خدا کے عطا کردہ اس رزق کو جسے مفادِ عامہ کے لئے رواں دواں رہنا چاہیئے بند لگا کر روک لیتے ہیں"۔ یہ ہوتا ہے نتیجہ "مصنوعی، ورمیکانکی صلوٰۃ کا!

اب اس نکتہ کی طرف آیئے کہ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ...... (۱۸/۱۰۵) "ان کے اعمال کے تولنے کے لئے، میزان تک کھڑی نہیں کی جائے گی"۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ عملِ خیر کا بھی ذرہ ذرہ تولا جائے گا اور عملِ شر کا بھی۔ تو یہ کس قسم کے اعمال ہیں جن کے تولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی؟ عملِ خیر اپنا خوشگوار نتیجہ مرتب کرتے ہیں۔ عملِ شر تخریبی اور تباہ کن نتائج پیدا کرتے ہیں، اس لئے ان کے موازنہ کی ضرورت ہوگی کہ کس قسم کے اعمال کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ لیکن جو اعمال کسی قسم کا نتیجہ ہی پیدا نہ کریں، انہیں تولا کس مقصد کے لئے جائے گا؟ یہ تو، وقت، توانائی، دولت کا ضیاع ہے، اس لئے یہ اعمال رائیگاں جائیں گے۔ (حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ)۔

انگریزی زبان میں ایک لفظ ہے۔ (MORAL) اسے عملِ خیر کہہ لیجئے۔ دوسرا لفظ ہے۔ (IMMORAL) اسے عملِ شر سے تعبیر کر لیجئے۔ تیسرا لفظ ہے۔ (AMORAL) یعنی جو نہ خیر ہو نہ شر۔ قرآنِ کریم کی رُو سے رائیگاں جانے والے اعمال کا شمار انہی میں ہوگا۔ یعنی وہ اعمال جو کوئی نتیجہ پیدا نہ کریں ــــــ نتیجہ تو یہ کوئی پیدا نہیں کرتے لیکن ان سے وقت، توانائی، مال و دولت کا جو نقصان ہوتا ہے وہ تو ظاہر ہے۔ ہزار برس سے ہمارے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تمام ارکانِ دین "نہایت باقاعدگی اور پابندی سے ادا ہو رہے ہیں لیکن اُمّت پست سے پست تر سطح پر پہنچتی چلی جا رہی ہے۔ ہم کبھی کھڑے ہو کر سوچتے نہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس اسی روش پر اور شدّت سے گامزن ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ "ثواب" کا وہی مذہب پرستانہ مفہوم ہے۔

یہ اجتماعی نظام قائم تھا تو اس کا چیلنج تھا کہ دنیا کا کوئی نظام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ مذہب (یعنی انفرادی جذبات کی تسکین بہم پہنچانے کا ذریعہ) بن گیا تو دیگر مذاہب کی سطح پر آ گیا۔ اسی بنا پر (مولانا) ابو الکلام آزاد (مرحوم) جیسوں نے "تمام مذاہب یکساں ہیں" کا نعرہ بلند کر دیا۔ یہ نعرہ تھا بھی (خود ساختہ) صداقت پر مبنی۔ "مذاہب" واقعی سب یکساں ہوتے ہیں کیونکہ ان کی غایت، افراد کے جذبات کی تسکین ہوتی ہے، اور یہ مقصد ہر مذہب میں حاصل ہو جاتا ہے۔ اسلام کو مذہب کی سطح پر رکھ کر آپ ہزار مباحثے اور مناظرے کرتے رہیئے اسے آپ کبھی دیگر مذاہب سے افضل ثابت نہیں کر سکیں گے۔ وہ تو دین تھا جو تمام مذاہب ہی سے نہیں، تمام ادیانِ عالم (دیگر نظام ہائے حیات) سے بھی افضل تھا ــــــ افضل ہی نہیں بلکہ منفرد، اور بے مثال اور بے نظیر! اس لئے کہ اس کا پروگرام (یہی صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج وغیرہ) جو درخشندہ نتائج پیدا کرتے تھے، دنیا کا کوئی نظام ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ جب ان ارکان کا مقصد (مروّجہ اصطلاح میں) حصولِ ثواب رہ گیا تو یہ دیگر مذاہب کی سطح پر آ گیا۔

یہ تھا وہ کام جو مذہبی پیشوائیت نے "ثواب" کی اصطلاح سے لیا۔ حتیٰ کہ اس سے ایصالِ ثواب کا عقیدہ

وضع کر کے، مُردوں کو بھی بخشوانے لگ گئے ــــــــ ثواب (یعنی قرآنِ کریم کے مفہوم کا ثواب) اور اسے مُردوں کو پہنچانا! جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے! ملوکیت پشت پناہ رہے تو کوئی پوچھ ہی نہیں سکتا کہ دین کے ساتھ یہ استہزا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ کچھ ملوکیت کے لئے مفید ہوتا ہے۔

ملوکیت کی، مذہبی پیشوائیت کو تلقین نہیں، حکم ہوتا ہے کہ "مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے"۔ اور مذہبی پیشوائیت یہ کہہ کر عوام کو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں مست رکھتی ہے کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔ دینؔ، ہر قیصر اور ہر کسریٰ کا تختہ اُلٹ کر دنیا کو دکھا دیتا ہے کہ ثواب اسے کہتے ہیں، اور مذہب میں عرفات کے میدان میں لاکھوں حاجی، رو رو کر دعائیں مانگتے ہیں کہ "یا اللہ! اسرائیل کا بیڑا غرق ہو۔ تو اس مغضوب علیہ قوم کو تباہ و برباد کر دے"۔ یہ دعائیں مانگ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے فریضۂ حج ادا کر دیا معلّم انہیں مبارک باد دیتے ہیں کہ "اللہ نے تمہارا حج قبول کر لیا۔ اس کے ثواب کے صلہ میں، ایسے کئی حج تمہارے نصیب ہوں (تاکہ ہماری دنیا اور تمہاری عاقبت سنور جائے!)" وہ مبارک بادیوں کے ان غلغلوں اور طنطنوں کے ساتھ وطن لوٹتے ہیں، اور دوسری طرف: ؎

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے ــــ کھو گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟ ــــ ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں ــــ کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری!
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری! (ارمغانِ حجاز، ص ۲۴۷)

یاد رکھئے! جس قدر کوئی قوم مذہبی عقائد میں پختہ اور مذہبی ارکان کی ادائیگی کی پابند ہوتی ہے، اتنی ہی وہ دین سے دُور اور اس سے برگشتہ رہتی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے الدّین کو پیش کیا تو قریش کی طرف سے بھی اس کی مخالفت ہوئی اور اہلِ کتاب (یہود اور نصاریٰ) کی طرف سے بھی۔ قریش کی مخالفت دنیاوی مصلحت کوشیوں کی بنا پر تھی اس لئے وہ ایک وقت پر جا کر ختم ہو گئی اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے برعکس، اہلِ کتاب کی مخالفت مذہب کی بنا پر تھی۔ وہ کہتے تھے کہ آپ جن عقائد اور احکام کے اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں انہیں ہم پہلے سے تسلیم کرتے ہیں ــــ ہم خدا، وحی، ملائکہ، انبیاءؑ، آخرت پر ایمان رکھتے، اور نماز، روزہ، حج، خیرات کے قائل ہیں۔ پھر آپؐ کا ہم سے مطالبہ کیا ہے؟ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ "مذہب" کے عقائد و ارکان کے پابند ہیں، اور حضورؐ کی دعوت الدّین کی ہے۔

ہم (مسلمانانِ عالم) بھی اہلِ کتاب کی سطح پر ہیں اور "مذہب" میں مگن۔ اقوامِ مغرب کا مفاد اسی میں ہے کہ ہم اسی میں مگن رہیں۔ چنانچہ یہ جو ہم اس وقت ساری دنیا میں "احیاءِ اسلام" کی تحریکوں کو سرگرمِ عمل دیکھ رہے ہیں تو یہ انہی اقوام کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ علامہ اقبالؒ بہت پہلے ہمیں اس سے متنبہ کر گئے تھے۔ خدا توفیق دے تو آپ ارمغانِ حجاز میں ان کی نظم ــــ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ــــ کا بغائر مطالعہ کریں۔ یہ سازش بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے گی۔

بابُ المراسلات

۱۔ سورۃ القریش کی اہمیت۔ قیامِ نظامِ اسلامی کی بنیادی شرائط

ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ قرآن مجید کے آخری پارہ کی آخری چھوٹی چھوٹی سورتوں میں سے، سورۃ القریش کی معنویت سمجھ میں نہیں آتی۔ قرآنِ مجید کی دعوت عالمگیر بھی ہے اور ابدی بھی، لیکن اس سورۃ کا تعلق زمانہ نزولِ قرآن کے قبیلۂ قریش سے ہے۔ جو کچھ اس سورۃ میں کہا گیا ہے، وہ ان کے ساتھ ختم ہو گیا۔ بعد میں آنے والے عالم انسانیت کے لئے اس میں کیا تعلیم اور کیا پیغام ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔

طلوعِ اسلام ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو اس سورۃ میں ایسا پیغام ملے گا جو عالمگیر بھی ہے، اور ابدی بھی، بلکہ اگر کہا جائے کہ وہ اسلامی نظام کی خشتِ اوّل ہے تو قطعاً مبالغہ نہیں ہو گا۔

زمانہ نزولِ قرآن میں، عربی معاشرہ کی یہ حالت تھی کہ ان کی کوئی چیز محفوظ نہیں رہتی تھی۔ ان کے مساکن میں ڈاکے پڑتے تھے اور ان کے قافلے سرِعام لوٹے جاتے تھے۔ لیکن اس میں قریش کی استثنائی تھی۔ کعبہ کے متولّی ہونے کی وجہ سے، دیگر قبائل، اور ہمسایہ ممالک میں وہ بڑے احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، اور انہوں نے ان سے ایسے عہد و پیمان کر رکھے تھے جن کی رُو سے ان کے قافلے ہر جگہ محفوظ رہتے تھے۔ اور ان کے گھر بار بھی مامون۔ اس بنا پر وہ بڑے امن اور مرفہ الحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۚ (۱۰۶/۱-۲)۔ یعنی اَلَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۚ (۱۰۶/۴)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھوک سے بھی محفوظ رکھا تھا اور ڈر خطرے سے بھی مامون۔ یہ تھی قریش کی حالت — فارغ البالی اور بے خوفی۔

اس کے بعد وہ نکتہ سامنے آتا ہے جسے ہم نے اسلامی نظام کی خشتِ اوّل کہا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ جب انہیں روٹی کی بھی فکر نہیں اور امن بھی نصیب ہے، تو اس کے بعد ان کے پاس کونسا عذر باقی رہ جاتا ہے کہ وہ اس نظام کو قائم نہ کریں جس کا مرکز خدا کا یہ گھر (کعبہ) ہے۔ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ...... (۱۰۶/۳) (اس کی بڑی اہمیت رکھتا ہے)۔ اس کے معنی ہیں کہ جب یہ دونوں شرائط پوری ہو گئی ہیں تو پھر یہ اس نظام کو کیوں قائم نہیں کرتے؟

اس میں عالمگیر پیغام یہ ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے بنیادی شرائط یہ ہیں کہ قوم بھوک اور خوف سے محفوظ اور مامون ہو۔ خود خدا نے قریش کو اس نظام کے قیام کی دعوت یہ کہہ کر دی تھی اور

انہیں اس کے قیام کا مکلف ٹھہرایا تھا کہ جب یہ دونوں شرطیں پوری ہو چکی ہیں تو پھر تم یہ نظام کیوں نہیں قائم کرتے؟

سورۃ النحل میں ہے کہ خدا انہیں یہی بات ایک مثال کے ذریعے سمجھاتا ہے۔ ایک بستی تھی جو امن و اطمینان سے رہتی تھی اور اسے رزق کی طرف سے بھی بے فکری تھی۔ انہوں نے کفرانِ نعمت کیا۔ .... فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ ..... تو اللہ نے انہیں بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ (۱۶/۱۱۲)

اس مثال سے واضح ہے کہ بھوک اور خوف خدا کا عذاب ہے، اور ظاہر ہے کہ جو قوم خدا کے عذاب میں ماخوذ ہو وہ نظامِ خداوندی قائم کر نہیں سکتی۔ ایسی قوم کو نظامِ خداوندی کے قیام کی دعوت دینا اور توقع کرنا کہ اس میں یہ نظام قائم ہو جائے گا، خود خدا کے پروگرام کے خلاف ہے۔ وہ اسی قوم کو اس کا مکلف قرار دیتا ہے جو بھوک کی طرف سے بے فکر اور خوف و خطر سے مامون ہو۔ حضورؐ نے اس نکتہ کی تشریح ان الفاظ میں فرما دی تھی کہ جس بستی میں کوئی ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو گیا اس سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

یہ ہے سورۃ القریش کا عالمگیر اور ابدی پیغام۔

—— (۰) ——

۲۔ حفظِ قرآن یا ناظرہ قرآن

سوال: رمضان شریف کی تراویح میں قرآنِ مجید ختم کیا جاتا ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ نہ امام کو اس کا علم ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید کی جو آیات وہ پڑھ رہا ہے ان کا مطلب اور مفہوم بلکہ معنی کیا ہیں، نہ ہی سامعین کو اس کا علم ہوتا ہے۔ امام، قرآنِ کریم کے الفاظ دہراتا چلا جاتا ہے اور مقتدی ان الفاظ کو سنتے جاتے ہیں بغیر سمجھے! سوال یہ ہے کہ کیا اس سے قرآنِ کریم کا وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے جس کے لئے اسے نازل کیا گیا تھا۔

بات تراویح میں ختمِ قرآن تک محدود نہیں۔ ہماری مسجدوں اور مذہبی مدرسوں .... میں بھی قرآنِ مجید ناظرہ پڑھایا جاتا ہے۔ یعنی قرآن مجید کے الفاظ پڑھائے جاتے ہیں، بلا مطلب ... اور ہمارے گھروں میں... (جہاں جہاں ابھی یہ روش باقی ہے) قرآن شریف ناظرہ ہی پڑھایا جاتا ہے۔ اس پر کچھ روشنی ڈالئے؟

جواب: یہ بات اس قدر روشن ہے کہ اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ قرآنِ کریم نے اپنی پہلی سطر میں اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ ...... (۲/۲)۔ یہ کتاب ہے۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ قرآنِ مجید ایک کتاب ہے۔

کیا آپ نے کبھی یہ دیکھا، یہ سنا ہے کہ کوئی شخص ایسی کتاب پڑھ رہا ہو جس کی زبان وہ نہیں جانتا۔

جس کے الفاظ کے معنی وہ نہیں سمجھتا! زبان نہ جاننا تو ایک طرف، اگر کوئی ایسی کتاب ہو جس کی زبان مشکل ہو تو آپ یہ کہہ کر اُسے رکھ دیتے ہیں کہ یہ کتاب مشکل ہے، میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر اس کتاب کی کچھ اہمیت ہے تو آپ کوشش کر کے اتنی استعداد پیدا کرتے ہیں کہ آپ اسے سمجھ سکیں۔ بہرحال آپ کسی کتاب کو نہیں پڑھتے جب تک اس کے معانی اور مطلب آپ سمجھ نہ سکیں۔

آپ دنیا کی کسی کتاب کے ساتھ ایسا نہیں کرتے۔ ایسا کرتے ہیں تو صرف خدا کی اس کتاب کے ساتھ! خدا کی یہ کتاب، الہدیٰ ہے۔ یعنی یہ زندگی کی ہر شاہراہ پر آپ کی راہنمائی کرتی ہے۔ یہ ضابطۂ قوانین ہے۔ اس میں وہ نسخے درج ہیں جو آپ کی ہر نفسیاتی مرض کے لئے شفا کا حکم رکھتے ہیں۔ یہ آپ کو زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے۔ یہ آپ کی اس دنیا کو بھی حسین اور شاداب بناتی ہے اور عاقبت بھی سنوارتی ہے۔ کیا یہ مقاصد اس کتاب کو سمجھے بغیر حاصل ہو سکتے ہیں؟ اس کے نازل کرنے والے نے خود ہی اس کی وضاحت کر دی ہے کہ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (۱۲/۲ ؛ ۴۳/۳)۔ ہم نے اس قرآن کو واضح عربی زبان میں اس لئے نازل کیا ہے کہ تم اسے سمجھ سکو۔ لفظ "عربی" عربی زبان کے لئے بھی بولا جاتا ہے، اور اس کے معنی "واضح" کے بھی ہیں۔ اسے دوسری جگہ: بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيۡنٍ ؀ (۲۶/۱۹۵) بھی کہا گیا ہے۔ صاف، واضح زبان میں۔ پھر آپ قرآن میں دیکھئے۔ جگہ جگہ تدبّر۔ تفکّر۔ تعقل۔ یعنی اس میں غور و فکر کرنے۔ اسے علم و بصیرت کی رُو سے سمجھنے کی تاکید آئی ہے۔ کیا یہ مقصد اس کے الفاظ کو (بلا معنی و مطلب) دھرانے سے حاصل ہو سکتا ہے؟ جہاں تک بلا سمجھے، کتاب کے الفاظ کو دھراتے رہنے کا تعلق ہے قرآن کریم نے یہودیوں کے خلاف یہ کہہ کر اعتراض کیا تھا کہ وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ ...... (۲/۷۸)۔ اس کا ترجمہ، تفسیر ابن کثیر کے مترجم، (مولانا) محمد جونا گڑھی (مرحوم) ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ان میں سے بعض اَن پڑھ ایسے بھی ہیں جو کتاب کے صرف ظاہری الفاظ کو ہی جانتے ہیں"۔ قرآن کریم نے، بلا سمجھے کتاب کے الفاظ دھرانے کو یہودیوں کی روش بتایا ہے اور اسے قابلِ اعتراض قرار دیا ہے۔ ہمارے بعض مترجمین نے لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ ..... کے معنی یہ کئے ..... ہیں کہ یہ لوگ، کتاب کو سمجھتے نہیں اور اپنی خوش عقیدگی میں مگن رہتے ہیں۔ کتاب کے الفاظ کو بلا سمجھے اسی صورت میں دھرایا جا سکتا ہے کہ انسان اپنی خوش عقیدگی میں مگن رہے کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔ قرآن ایک کتاب ہے جسے بلا سمجھے پڑھنے سے اس کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن حفظ کرنے سے اس کی حفاظت کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ جس زمانے میں طباعت کا انتظام نہیں تھا، حفظ کرنا حفاظتِ قرآن کا ایک ذریعہ ضرور تھا۔ لیکن اس زمانے میں جب طباعت اور نشر و اشاعت کے اس قدر وسیع وسائل اور انتظامات موجود ہیں، حفاظتِ قرآن کے لئے اس کے حفظ کرنے کی اتنی اہمیت نہیں رہی۔ لیکن ہم یہ نہیں کہتے کہ قرآن حفظ نہ کیا جائے۔ ہم کہہ یہ رہے ہیں کہ قرآن کو بلا سمجھے نہ (ناظرہ) پڑھا جائے، نہ حفظ کیا جائے۔ قرآن کا سمجھنا، اس کے مقصد کے حصول کا بنیادی ذریعہ ہے جس کا اوّل

ہیں جنہوں نے قرآن حفظ کیا تھا (اور ہم تو سمجھتے ہیں کہ ان میں شاید ہی کوئی ایسے ہوں جنہیں قرآن کم و بیش حفظ نہ ہو) تو ان کی زبان عربی تھی اس لئے وہ جو کچھ حفظ کرتے یا پڑھتے تھے اسے سمجھتے بھی تھے۔ ہم تو اپنی بات کر رہے ہیں کہ ہماری زبان عربی نہیں اور ہم بلا سمجھے قرآنِ مجید کے الفاظ دہرا لینے سے اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ اس کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ ہماری اس خوش فہمی نے اُمّت کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم، قرآن کے محفوظ ہونے کے باوجود، اس کی راہنمائی سے محروم ہیں۔ جس کتاب سے راہ نمائی نہ حاصل کی جائے اس کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ قیامت میں حضورِ نبی اکرمؐ خدا سے شکایت (یا فریاد) کریں گے کہ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰) "اے میرے رب! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا"۔ کتاب کو چھوڑ دینے میں دونوں شکلیں شامل ہیں۔ کتاب کو بلا سمجھے پڑھتے رہنا یہ بھی اسے چھوڑ دینے کے مرادف ہے۔ اور اسے سمجھ کر اس پر عمل نہ کرنا، یہ بھی اسے چھوڑ دینا ہے۔ اگر اسے سمجھا ہی نہ جائے تو اس پر عمل کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ عمل کرنے کا اوّلیں زینہ اسے سمجھنا ہے۔ قوم کو جو مطمئن کرا دیا گیا ہے کہ اس کے بلا سمجھے پڑھنے سے ثواب ہوتا ہے، تو اسے سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت کی طرف اس کا ذہن منتقل نہیں ہونے پاتا۔ اگر ہم اس کے ذہن میں یہ حقیقت راسخ کر دیتے ...... کہ قرآنِ کریم کو سمجھ کر پڑھنے ہی سے اس کا مقصد حاصل ہوتا ہے تو پھر وہ بلا سمجھے ...... پڑھنے پر مطمئن ہو کر بیٹھ نہ جاتی۔ جس قدر انتظامات قرآن کو بلا سمجھے پڑھنے پڑھانے اور سننے سنانے کے لئے کئے جاتے ہیں، اگر اس کا عشرِ عشیر بھی اس کے سمجھنے سمجھانے کے لئے کیا جاتا تو ہماری حالت کچھ کی کچھ ہو جاتی۔ لیکن ہم شاید اسی میں اپنی بچت سمجھتے ہیں کہ قرآن کو سمجھنے کی طرف قوم کا ذہن منتقل نہ ہونے پائے۔ اس لئے کہ قرآن کا بے نقاب ہونا ؎

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

اس لئے خیریت اسی میں ہے کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے (ارمغانِ حجاز)

قوم کو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں مست رکھنے کی مؤثر ترین صورت یہ ہے کہ اسے یقین دلا دو کہ قرآن کے الفاظ دہرا لینے سے ثواب ہوتا اور خدا کے ہاں سے اس کا اجر ملتا ہے۔

(o)

اُمّت میں اتحاد

سوال: اگلے دنوں کوئی صاحب ٹیلی ویژن پر ایک تقریر کے دوران کہہ رہے تھے کہ قرآنِ مجید اُمّت میں اتحاد کا تقاضا کرتا ہے۔ مجھے تو قرآن میں اتحاد کا لفظ تک نہیں ملا۔ کیا آپ اس کی وضاحت فرمائیں گے کہ قرآنِ مجید کا تقاضا کیا ہے؟

جواب: آپ نے صحیح سمجھا ہے۔ قرآن مجید میں اتحاد (یا متحدہ وغیرہ) کے الفاظ نہیں ہیں۔ نہ ہی وہ اُمت سے اتحاد کا تقاضا کر سکتا تھا۔ آپ غور کیجئے کہ اتحاد کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اگر مختلف جماعتیں، پارٹیاں، گروہ، حتیٰ کہ مختلف اقوام کسی مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے مل کر کوشش کریں، تو اُسے اتحاد کہتے ہیں اور ان کے اس انداز کو متحدہ محاذ۔ جیسے ۱۹۷۷ء میں ملک کی مختلف پارٹیوں نے ایک مشترکہ مقصد کے لئے "متحدہ محاذ" قائم کیا تھا۔ اس اتحاد کے زمانے میں بھی ان میں سے ہر پارٹی نے اپنا اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھا تھا، اور جب وہ پروگرام ختم ہو گیا تو وہ پارٹیاں حسبِ سابق پھر منتشر ہو گئیں۔ اس سے واضح ہے کہ اتحاد، مختلف گروہوں میں ہوتا ہے۔ جیسے اقوامِ متحدہ کا ادارہ۔ اس میں ہر قوم اپنا اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھتی ہے۔

قرآن کا مقصد "اُمتِ واحدہ" کی تخلیق ہے اور ظاہر ہے کہ امتِ واحدہ میں مختلف پارٹیوں اور ان کے جداگانہ تشخص کا تصور تک نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اُمت میں اتحاد کے کیا معنی! ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم اپنی موجودہ حالت اور مروّجہ اسلام کو برقرار رکھتے ہوئے، دین یا قرآن کی بات کرتے ہیں۔ موجودہ مسلمان "اُمتِ واحدہ" نہیں ہیں۔ ان میں مختلف قومیں، مختلف جماعتیں، مختلف پارٹیاں اور مختلف مذہبی فرقے ہیں۔ ان مختلف عناصر میں باہمی مخاصمت اور معاندت لازمی ہے۔ جب ہمیں ان کے اختلافات سے پیدا شدہ مضرات کا احساس ہوتا ہے تو ہم اس کا مداوا باہمی اتحاد میں تلاش کرتے ہیں اور اسے اسلام یا قرآن کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔ یہ حضرات یا تو اسے سمجھتے نہیں اور یا ایسا برملا کہنے کی جراُت نہیں پاتے کہ اُمت جب مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے تو پھر نہ وہ اُمت، اُمتِ مسلمہ رہتی ہے، نہ ان ٹکڑوں میں سے کوئی ٹکڑا اسلامی۔ ان میں اتحاد، مصلحتوں کا تقاضا ہوتا ہے، اسلام کا نہیں۔ اسلام کا تقاضا اُمت کی وحدت ہے ... اتحاد نہیں۔

یاد رکھیے! جب تک ہم اس بنیادی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ اُمت کا مختلف گروہوں، پارٹیوں اور فرقوں میں بٹ جانا اسلام کی نقیض ہے، ہمارا کوئی قدم اسلام کی طرف نہیں اُٹھ سکتا۔

— (۰) —

کتاب وسنّت اور مختلف فرقے

تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد، ہمارے علما حضرات کی طرف سے مطالبہ (بلکہ تقاضا) شروع ہو گیا کہ ملک میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہونا چاہیئے۔ اس پر حقیقت شناس حضرات کی طرف سے یہ کہا گیا کہ آپ (علماء) مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر فرقہ کا اسلام کا تصوّر الگ الگ ہے۔ ایسی صورت میں ایسا ضابطۂ قوانین کس طرح مرتّب ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے مختلف فرقوں کے نمائندوں پر مشتمل (۳۱۔ علماء) کی ایک کانفرس منعقد کی اور اس میں یہ منشور پاس کر دیا کہ پاکستان کا ضابطۂ قوانین "کتاب وسنّت" کے مطابق مرتب کیا جائے۔ یہ کہا، اور ملک میں

شور مچا دیا کہ دیکھئے، تمام فرقے اسلامی قوانین کے مطالبہ پر کس طرح متفق ہو گئے ہیں؟

اسی بنا پر پاکستان کے دستور میں یہ شق شامل کر دی گئی کہ تمام قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب اور رائج ہوں گے۔ اس مقصد کے لئے ایک اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل کی گئی کہ وہ مشورہ دیا کرے کہ زیر تدوین قانون کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اب ایک شرعی وفاقی عدالت قائم کی گئی ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ جو قانون کتاب و سنت کے خلاف ہو، اسے کالعدم قرار دینے کا اہتمام کرے۔ قوم مطمئن ہو گئی کہ اسلامی قوانین کا مسئلہ حل ہو گیا۔

لیکن ذرا غور کیجئے کہ وہ جو انہوں نے کہا تھا کہ تمام علماء متفق ہو گئے ہیں، تو وہ متفق کس بات پر ہوئے تھے؟ اس منشور پر دستخط کرنے والوں میں شیعہ علماء بھی تھے، سنی بھی۔ سنیوں میں حنفی بھی تھے اور اہل حدیث بھی۔ حنفیوں میں دیوبندی بھی تھے اور بریلوی بھی۔ یہ سب متفق ہوئے تھے اس بات پر کہ "قوانین کتاب و سنت کے مطابق ہونے چاہئیں" جب کتاب و سنت کے مطابق قانون سازی کا عملاً مرحلہ آیا اور زکوٰۃ کے متعلق ایک قانون نافذ ہوا تو سب سے پہلے شیعہ حضرات نے اعتراض کیا کہ وہ قانون "ان کی کتاب و سنت" کے مطابق نہیں۔ حکومت کو کہنا پڑا کہ بہت اچھا! آپ اپنی کتاب و سنت کے مطابق عمل کر لیا کریں۔ اس پر اور گوشوں کی طرف سے بھی سرگوشیاں ہوئیں تو حکومت کو اجازت دینا پڑی کہ سب "اپنی اپنی کتاب و سنت (فقہ) کے مطابق عمل کر لیں!" یہ حشر ہوا اس پہلے قانون کا جو علماء کرام کے متفق علیہ مطالبہ کتاب و سنت کے مطابق بنایا گیا تھا!

اب آگے بڑھیئے! حکومت نے مختلف اداروں میں علماء کو شامل کیا ہے کہ کتاب و سنت کے مطابق قانون سازی میں مدد دیں۔ اس سلسلے میں ذیل کی خبر پڑھیئے:-

> کراچی ۲ ر جولائی (سٹاف رپورٹر) ممتاز اہل حدیث راہنماؤں نے حکومت سے اپیل کی ہے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے تشکیل دی جانے والی ہر کونسل، کمیٹی اور ادارے میں اہلحدیث مسلک کے علماء کو بھی نمائندگی دی جائے۔ یہ راہنما آج یہاں مقامی ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے۔ ان راہنماؤں میں امیر جماعت غرباء اہل حدیث پاکستان، مولانا عبدالرحمٰن سلفی۔ جمعیت اہل حدیث کراچی کے صدر، حاجی محمد سعید نمونہ والے، اور ناظم اعلیٰ جمعیت اہل حدیث حیدر آباد، محمد اسحاق اصغر سلفی شامل تھے۔ اور ان تینوں کے ترجمان کی حیثیت سے حاجی محمد احمد لوہیا چیئرمین اہل حدیث مطالبہ کمیٹی نے اخبار نویسوں سے خطاب کیا۔
>
> انہوں نے اس امر پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ خالص کتاب و سنت پر مبنی فکر رکھنے والے مکتبہ فکر کو اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شریعت بنچ اور سپریم کورٹ کے شرعی بنچ میں کوئی نمائندگی نہیں دی گئی...... انہوں نے کہا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے بننے والی ہر

کمیٹی میں اہلِ حدیث علماء کو مناسب نمائندگی دی جائے۔
بعد میں اخبارات میں یہ خبر بھی شائع ہوئی تھی کہ اہلِ حدیث علماء پر مشتمل ایک وفد نے صدرِ مملکت سے ملاقات میں ان مطالبات کو پیش کیا ہے۔ اور یہ خبر بھی کہ اس فرقہ کے ایک عالم (مولانا) عطاء اللہ حنیف کو نظریاتی کونسل کا رکن مقرر کر دیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ان حضرات نے کہا یہ ہے کہ ... "خالص کتاب و سنت"..... پر مبنی مکتبۂ فکر رکھنے والے مکتبۂ فکر کو بھی نمائندگی دی جائے ___ یعنی "کتاب و سنت" بھی دو قسم کی ہے۔ ایک "خالص کتاب و سنت" اور دوسری (لامحالہ) "ناخالص کتاب و سنت" ___ معلوم نہیں اس کے جواب میں غیر اہلِ حدیث علماء کیا کہیں گے؟ اور جب کسی قانون کے مرتب کرنے کا سوال آئے گا تو "خالص کتاب و سنت" کے نمائندگان اور ناخالص کے نمائندگان میں کس قسم کی سر پھٹول ہوگی؟

کس قدر بدقسمت ہے وہ قوم جس کے ارباب فکر و دانش اتنا نہیں سوچتے کہ ملک میں اسلام کے نام پر ہو کیا رہا ہے، اور اس کا انجام کیا ہوگا!

———(o)———

پنجۂ ہنود

اسلام آباد سے شائع ہونے والے، انگریزی روزنامہ، دی مسلم، کی ۲۶ اگست کی اشاعت میں (ا، م، م۔ لندن کے حوالہ سے) مظلوم و مقہور ہندی مسلمانوں کے متعلق ایک شذرہ شائع ہوا ہے جس میں لکھا ہے:۔

"ہندوستان کے قصبوں اور شہروں کے گلی کوچوں میں، مسلمان اقلیت کے قتل و غارت گری کے واقعات اس قدر کثرت اور شدت اختیار کر گئے ہیں جس کی نظیر اس سے پہلے سنی تک نہیں گئی تھی۔ قتل و خون ریزی کے ان واقعات کے دوش بدوش مسلمانوں پر، حکومت سے عدمِ وفاداری، مذہبی جنون اور کینہ و عداوت کے الزامات، ہندو اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ کا معمول بن چکے ہیں۔ ہندوستان کے "قدیم محافظوں" کے تمام ارکان، مسلمانوں کے خلاف اس الزام تراشی کی مہم میں برابر کے شریک ہو چکے ہیں (مثلاً) ہندو جریدہ میں، جے۔ بی۔ کرپلانی (جیسے سیاسی لیڈر) کے مضامین جہاں ایک طرف، ان فسادات اور قتل و غارتگری کے واقعات کی سنگینی کو نہایت نرم کر کے پیش کرتے ہیں، دوسری طرف، مسلمانوں کی مزعومہ برائیوں کو بڑھے نمایاں انداز میں سامنے لایا جاتا ہے۔ اگر (یہ) ہندو لیڈر، ان فرقہ وارانہ فسادات کی کھلے بندوں مذمت کرتے، تو ان خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کی وارداتوں میں یقیناً کمی واقعہ ہو جاتی۔

کرپلانی جیسے لیڈروں کی طرف سے، ان فسادات کی تحقیق کی تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے شہری ہونے کا اہل ہی نہیں بنایا۔ (ان کا کہنا ہے کہ) آریوں کے بعد، شمال کی جانب سے مختلف اقوام اور قبائل ہندوستان میں آتے رہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو ہندوؤں کے اندر جذب کر دیا اور ہندو دھرم کے

مختلف فرقوں کی شکل اختیار کرلی۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس طرح ہندو دھرم میں جذب نہ ہونے دیا اور اپنی جداگانہ شخصیت کو باقی رکھا۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں (یعنی اسلام کے صدرِ اوّل کے زمانے میں) جو کچھ عربوں کے ہاں ہوتا تھا، وہ اسے مقدس اور غیر متبدل تصور کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے مذہب کے اس تصور کو خیرباد کہہ دیں۔ انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ہندوستان میں اسی صورت میں قابلِ قبول ہو سکتے ہیں کہ وہ عربی اسلام کو تیاگ کر، ہندو مذہب کا ایک فرقہ بن جائیں جس طرح باہر سے آنے والے دیگر قبائل نے کیا تھا۔ یہی وہ معیار ہے جس سے یہ پرکھا جا سکے گا کہ وہ ہندوستان کے وفادار شہری ہیں یا نہیں۔"

پاکستان میں بسنے والے وہ مارِ آستین جو اٹھتے بیٹھتے یہ پراپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ اگر ہم انڈیا سے وابستہ رہتے تو ہمارا کیا بگڑتا، وہ ذرا ان حقائق کا آنکھیں کھول کر مطالعہ کریں! لیکن یہ وہاں ہندوؤں میں جذب ہو جاتے۔ اس طرح "ان کا کچھ بھی نہ بگڑتا"!

۱۳۲۱

(○)

اسلامی ممالک ڈاکٹر صاحب
مطلب صاحب

صدرِ مملکت نے فرمایا

روزنامہ نوائے وقت کے میگزین ایڈیشن بابت ۳۱ جولائی ۱۹۸۱ء میں یہ خبر چھپی ہے کہ صدرِ مملکت نے رمضان المبارک کے آخری دنوں اسلام آباد میں صحافیوں کو ایک افطار پارٹی میں مدعو فرمایا۔ اس میں صدرِ محترم سے مختلف موضوعات پر سوالات کیے گئے اور انہوں نے اس کا تفصیل سے جواب دیا۔ وہ بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ ایک صحافی نے صدر سے کہا کہ وہ ہر سال ۲۷ ویں رات "مسجدِ نبویؐ" میں عبادت میں گذارتے ہیں۔ اس مرتبہ ان میں سے بھی کسی کو ساتھ لے جائیں، تو صدر کا جواب تھا۔

بلاوا اوپر سے آتا ہے۔

(○)

تاریخ اس طرح بنتی ہے!

روزنامہ نوائے وقت کے عید الفطر کے خصوصی ایڈیشن میں، ابوسعید انور صاحب کے قلم سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا موضوع ہے "آزادی اور عید۔ کیسے گذری؟ کیا ہوا؟" اس کا عنوان جلی حروف میں یوں دیا گیا ہے :-

قیامِ پاکستان کے بعد، پہلے ۲۷ رمضان کی روداد، جس روز حسنِ اتفاق سے عید تھی۔

"۲۷ رمضان جس روز حسنِ اتفاق سے عید تھی"

سو سال کے بعد تاریخ کے محقق سر جوڑ کر بیٹھیں گے یہ معمہ حل کرنے کے لئے کہ ۲۷ رمضان کو "حسنِ اتفاق سے" عید کس طرح تھی؟ ولامحالہ وہ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ پاکستان میں اسلامی نظام رائج ہوتا تھا، غالباً اس کی ابتدا اسی طرح سے کی گئی ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یوں تاریخِ پاکستان کی پہلی اینٹ رکھی جائے گی!